قومی ترقی کا لائحہ عمل

ابراہیم احمد باوانی

MEMON
BOOK FOUNDATION
OF PAKISTAN

MBF

قومی ترقی کا لائحہ عمل

ابراہیم احمد باوانی

Qaumi Taraqqi Ka Lahai Amal

Author:	Ibrahim Ahmed Bawany
Language:	Urdu
First Print Edition:	May 1973
Second Print Edition:	July 2009
Graphics By:	M. Tasneem Chunawala
Published By:	Memon Book Foundation of Pakistan
Digital Edition:	23rd March 2011
Digitalized By:	Qasim Moosa Lawai Shoaib Ghaziani

Digital Publisher

www.memonbooks.com

فہرست

	پیش لفظ ۔ جناب اے ۔ کے ۔ بروہی	۳
۱۔	تعارف : ایک نیا لائحہ عمل	۱۱
۲۔	ہمارے قومی مقاصد	۴۱
۳۔	زرعی انقلاب	۴۹
۴۔	صنعتوں کا قیام کب اور کہاں؟	۶۳
۵۔	تعلیمی انقلاب	۷۷
۶۔	مسلح افواج کا انقلاب	۸۴
۷۔	تعمیر مکانات میں انقلاب	۹۱
۸۔	بدعنوانیوں کے خلاف جہاد ۔ سماجی انقلاب	۹۴
۹۔	سود کی لعنت	۱۰۱
۱۰۔	نتائج اور خلاصہ	۱۶۹

پیش لفظ

"قومی ترقی کا انقلابی لائحہ عمل" پاکستان کے عوام کی موجودہ حالتِ زار کا ایک بصیرت افروز جائزہ ہے۔ پاکستان کے عوام کو جو مسائل درپیش ہیں اُن کے ضمن میں تعمیری طریق کار اس میں پیش کیا گیا ہے، نیز وہ خطوط تجویز کیے گئے ہیں جن پر چل کر ہمارے معاشرے کی از سرِ نو تشکیل کی جاسکتی ہے۔

مصنف کو ایک تاجر کی حیثیت سے، ہماری حالیہ قومی تاریخ کا براہِ راست عملی تجربہ رہا ہے۔ انھوں نے اپنی عملی دنیا کے تجربے اور اس کے مسائل کے پسِ منظر میں پاکستان کے گزشتہ بیس سال کی معاشی ترقی اور نشوونما کا جائزہ لیا ہے۔ اس خصوص میں یہ حقیقت اہم ہے کہ مصنف نے ہماری قومی تاریخ کا جائزہ اسی نقطۂ نظر سے لیا ہے جسے اسلامی کہا جاسکتا ہے۔ ایک سچے مسلمان کی حیثیت سے وہ ان پالیسیوں اور پروگراموں کو پیش کرنے کے انتہائی متمنی ہیں جن کا مقصد مملکت پاکستان کی نظریاتی بنیاد کو مستحکم کرنا ہے جدید دور کے لیے اسلام کی تعلیم کے تاریخی منصب پر ایک غیر متزلزل ایمان کی بنیاد پر انھوں نے "قومی ترقی کا لائحہ عمل" تحریر کیا ہے۔ بلاشبہ کوئی شخص بھی جو اس کتاب کو توجہ سے پڑھے گا اپنے اندر ایک خاص قسم کی تبدیلی محسوس کرے گا جو اس وقت پیدا ہوتی ہے جب ہم قدیم اور معروف اشیاء کو اعلیٰ سطح سے دیکھنے کا آغاز کرتے ہیں۔ علم سیاسیات اور معاشیات میں بھی مشاہدہ بہت اہمیت رکھتا ہے جس سے کوئی شخص حقائق کا تجز

کرتا ہے اور اسی پر نتائج کا دارومدار ہوتا ہے ۔ اس کتاب میں ہمیں پاکستان کے قومی حالات کو ایک اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھنے کی دعوت دی گئی ہے ۔

ہمارے مصنف کی موجودہ کتاب ان مسلمان مفکروں کی متعدد کتابوں میں سے ایک ہے جو تاریخ کو صحیح سمت میں رکھنا اور واضح حقائق اور اعداد و شمار کی روشنی میں یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اشتراکیت پسندوں نے اچانک جن معاشی خرابیوں اور سماجی ناانصافیوں کے بارے میں اس قدر شور و غل مچانا شروع کر دیا ہے ان کو دور کرنے کا بہتر طریقہ اسلام کے پاس موجود ہے ۔ چنانچہ ہمارے ملک میں حقیقی تنازعہ "قومیانے" اور "نہ قومیانے" کے مابین نہیں ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دائیں بازو کی سیاسی جماعتیں جو مذہبی طرزِ حیات پر ایمان رکھتی ہیں ، اپنے منشوروں میں یہ یقین دہانی کر چکی ہیں کہ اگر ضرورت پڑی تو وہ ہمارے معاشرے کی معاشی صحت کا تحفظ کرنے کے لیے بعض صنعتوں کو قومی ملکیت میں لے لیں گے ۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت اصل تنازعہ کی جڑ اشتراکیت پسندوں کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ ایک دوسرا حریفانہ مذہب پیش کرتے ہیں جو اسلام سے برتر ہے ۔ یعنی بالفاظ دیگر اشتراکیت دنیا اور انسان کی ترقی کا مکمل اور جامع فلسفہ ہے ۔ اسلام کے نام پر اس دعویٰ کی سختی سے مخالفت کی جاتی ہے کیونکہ پاکستان کے عوام صمیم قلب سے یہ ایمان رکھتے ہیں کہ اسلام ہی انھیں "صراطِ مستقیم" دکھاتا ہے اور نوعِ انسانی کو آج اور آنے والے تمام زمانوں کے لیے ان کے معاشی و سماجی مسائل حل کرنے کا طریقہ بتاتا ہے ۔ یہ طریقہ آج بھی اتنا ہی سچا ہے جتنا چودہ سو سال قبل تھا جب پہلے پہل اسے پیغمبرِ اسلامؐ پر منکشف کیا گیا اور جس پر وہ بہ نفسِ نفیس عمل پیرا رہے ۔

اے ۔ کے ۔ بروہی

۷۰ ، مسلم آباد ۔ کراچی ۵
پاکستان

باب اوّل

تعارف —— ایک نیا لائحہ عمل

میں بالکل آغاز ہی میں اپنے قارئین پر یہ امر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں کوئی ادیب نہیں ہوں اور فن تحریر کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے جس قسم کی صلاحیت اور تربیت درکار ہوتی ہے وہ مجھے کبھی میسر نہ آسکی حقیقت یہ ہے کہ اپنی خواہش کے باوجود میں اتنا وقت بھی نہیں نکال سکا جو مطالعہ تحقیق اور تصنیف کے کم سے کم مطالبات کی تکمیل کے لیے ضروری ہو سکتا ہے۔ تجارت و صنعت میں مصروف رہنے والے انسان کی اپنی بعض مجبوریاں ہوتی ہیں جن کا میں کسی جھجک کے بغیر اعتراف کرتا ہوں۔

بایں ہمہ یہ کہا جاتا اور تسلیم کیا جاتا ہے اور مجھے اس کا اعتراف کرنا چاہیے کہ بعض حالات ایسے ہوتے ہیں جب انسان کے لیے اپنا کرب ناقابلِ برداشت ہو جاتا ہے اور یہ ایک بدیہی امر ہے کہ ذہنی اور جذباتی کرب جسمانی مصائب کے مقابلے میں زیادہ اذیت ناک ہوتا ہے۔ اس روحانی کرب نے مجھے مجبور کیا کہ میں اپنے پڑھنے والوں کو ان تصورات میں شریک کروں جو مجھے اذیت پہنچاتے رہے ہیں۔ اپنے طرزِ بیان کے کھردرے پن کے باوجود اگر میں اپنے خیالات کا لب لباب دوسروں تک پہنچانے میں کامیاب ہو گیا تو مجھے کوئی غم نہ ہوگا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں حسنِ اسلوب اور ندرتِ اظہار کا مظاہرہ کرنے سے قاصر ہوں تاہم دراصل میں صرف ان خیالات کا اظہار کرنا چاہتا ہوں جو میرے ذہن میں ایک خلفشار برپا کرتے رہے ہیں اور اس کرب و ابتلا کا اظہار کرنا چاہتا ہوں، جس نے میری روح کو بے چین کر دیا ہے۔ اگر میرے قارئین میری معروضات کے متعلق مجموعی

تک پہنچ گئے اور ان کی روح سے آگاہ ہو گئے تو میں اسی کو اپنا سب سے بڑا اعزاز تصوّر کروں گا۔ کیونکہ بہرکیف جیسا کہ رومی نے کہا ہے کہ مغز ہی کی اہمیت ہے اور استخوان کو تو کتوں کی غذا بنانے کے لیے پھینک دیا جاتا ہے۔

مجھے اس امر کا اعتراف ہے کہ موجودہ مقالہ بڑے ذاتی دباؤ کے تحت سپردِ قلم کیا جا رہا ہے جو جسمانی سے زیادہ روحانی اور جذباتی ہے۔ جبر و استبداد کے شکنجے میں جکڑی ہوئی پاکستانی قوم کی ناگفتہ بہ حالت کا جائزہ لینے کے بعد میں اپنی ذہنی کیفیات کو معرضِ اظہار میں لانے کے لیے بے تاب تھا۔ ہماری ظاہری زندگی میں جو افسوسناک تبدیلیاں رونما ہوئیں اس نے میرے وجود کے تار و پود کو مرتعش کر رکھ دیا۔ اس نظریے کی بتدریج قطع و برید ہوتی رہی جس کے لیے یہ ملک معرضِ وجود میں لایا گیا تھا۔ بدعنوانی رشوت ستانی اور اقربا پروری کا سیلاب بڑھتا رہا۔ علاقہ داریت اور صوبائی عصبیت کو ہوا دی جاتی رہی۔ سیاسی آزادی پر پابندیاں رہیں ذاتی مقاصد کے لیے معاشی استحصال، اور عوامی ضروریات کی طرف سے مکمل بے توجہی ہوتی گئی۔ ایک ذیلی نظام کار کی نشوونما کی گئی جو معیشت اور معاشرے کی مناسب ترقی و بہبود میں مدد دینے کے بجائے ایک وبال اور پوشیدہ دشمن بن گیا ان سب نے میری روح کو ایک ناقابلِ برداشت اذیت سے ہمکنار کر دیا۔ میں اپنے خیالات اور احساسات کو معرضِ اظہار میں لانا چاہتا تھا۔ لیکن آمریت نے جس طرح پاکستان کو ایک زندان بنا دیا تھا، اس میں کسی کے لیے صداقت کو بیان کرنا ناممکن ہو گیا تھا۔

اظہارِ رائے کی آزادی پر جو پہرے لگائے گئے وہ زیادہ سے زیادہ سنگین اور دہشت انگیز ہو گئے۔ "مسلم نیوز انٹرنیشنل"[1] جیسا جریدہ خود سابق صدر

---

[1] "مسلم نیوز انٹرنیشنل" بیگم عائشہ باوانی وقف، کراچی کی جانب سے شائع ہوتا ہے۔ سنجیدہ اور ذمہ دارانہ صحافت اس کا نصب العین ہے اور یہ عالمِ اسلام کے سماجی معاشی کوائف کی پیش کش

ایوب خاں کی آنکھوں میں کھٹکنے لگا۔ انھوں نے بطورِ خاص مجھے راولپنڈی طلب کیا اور درشت لہجے میں مجھے بتایا کہ **مسلم نیوز انٹرنیشنل** "گندہ، گھناؤنا اور لغو" ہے۔ اگرچہ وہ اپنی رائے کی حمایت میں ایک مثال بھی پیش نہیں کر سکے۔ مجھے آج تک کوئی اور ایسا ذی ہوش فرد نہیں ملا جس نے سابق صدر کی اس رائے کی تائید کی ہو۔ میرا خیال ہے کہ ان کا اشارہ مذکورہ جریدے کی اس کوشش کی سمت تھا جو وہ اسلام کو صحیح شکل میں پیش کرنے کے لیے کرتا تھا اور اس تحریف شدہ اور مسخ شدہ صورت کو پیش نہیں کرتا تھا جسے ترقی پسند صدر موصوف اور ان کے محقق علما، پُر زور انداز میں "جدید اسلام" کا نام دیتے تھے۔ حالات اس قدر ابتر ہو گئے تھے کہ صرف اسی طبقے نے خوشحالی حاصل کی اور ہر جگہ صرف انھیں لوگوں کا خیر مقدم کیا گیا جو چاپلوسی اور خوشامد میں ہمہ تن مصروف رہتے تھے۔

میں نے اس ذہنی پس منظر میں جب اپنے خیالات کو قلم بند کرنا شروع کیا تو میری مقید روح کو فرار اور سکون کا صرف یہی راستہ مل سکتا تھا۔ واضح الفاظ میں یوں عرض کروں کہ میں نے اس ذہنی دباؤ اور کرب سے خود کو نجات دلانے کے لیے یہ ذریعہ اختیار کیا جو ناقابل برداشت بنتا جا رہا تھا اور جو مجھے رفتہ رفتہ ایک قسم کے اعصابی ہیجان کی طرف کھینچے لیے جا رہا تھا۔ میں نے اپنے خیالات کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنا شروع کر دیا تاکہ میں اس خود بیانی کے ذریعے کچھ تسکین حاصل کر سکوں نیز ایک اُمیدِ موہوم یہ بھی تھی کہ کسی نہ کسی دن یہ تحریری مواد افراد کے وسیع تر حلقوں

کے لیے وقف ہے۔ اسلام اور اسلامی تاریخ و ثقافت پر بھی اس میں مقالات شائع ہوتے ہیں۔

تک پہنچ کر فکر و بحث کے لیے کچھ غذا مہیا کر سکتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب وہ وقت آگیا ہے جب اختلافاتِ رائے کو کان دھر کر سُنا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اب میری ہمت بندھی ہے کہ میں اپنے تاثرات اپنے ہم وطنوں کے سامنے پیش کروں۔ میں نے حتی الامکان کوشش کی ہے کہ بہت اختصار اور موزونیت سے کام لوں۔ اس لیے نہیں کہ میرے پاس تفصیلات کی کمی ہے بلکہ اس لیے کہ میں سب سے پہلے اُن اُمور پر توجہ مرکوز کرانا چاہتا ہوں جو نسبتاً زیادہ بنیادی اور نازک ہیں۔ فنی تفصیلات کے مقابلے میں مقاصد اور بنیادی لائحہ عمل زیادہ اہم ہیں۔ میرا ارادہ یہ ہے کہ مسائل کو ان کی تدریجی اہمیت کے لحاظ سے پیش کروں۔ اس مرحلے پر کسی مفصل اور بہت بسیط مطالعے کو پیش کرنے سے یقیناً وہ بنیادی موضوعات پسِ پشت پڑ جائیں گے جن پر میں زور دینا چاہتا ہوں۔ طریق کار کی ندرت ایک اور عنصر ہے جس نے مجھے اختصار پر مجبور کیا۔ میں جس زاویۂ نگاہ سے مسئلے کو دیکھتا ہوں وہ مروجہ نقطۂ نظر اور طریق کار سے بنیادی طور پر اس قدر مختلف ہے کہ میں نے اس مقالے میں صرف ضروری اجزا کو بیان کرنے تک خود کو محدود رکھا ہے۔ اگر اس نئے طریق کار نے عوام الناس میں کسی قسم کی مقبولیت حاصل کر لی تو ان موضوعات پر اس سے کہیں زیادہ مفصل اور بسیط مطالعہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ میں نے مسئلے کے بنیادی جزو پر توجہ مرکوز کی ہے اور خود کو صرف اسی تک محدود رکھا ہے۔ چنانچہ کتابچے میں انتہائی اہم مبادیات کے سوا کچھ اور بیان نہیں کیا گیا ہے۔ لیکن مجھے اُمید ہے کہ اس سے میرے قارئین اس زاویۂ نگاہ سے آگاہ ہو جائیں جس سے میں اپنے ملک کے مسائل کا جائزہ لینے کی کوشش کر رہا ہوں۔

مسئلے کی فی الواقع نوعیت پر بحث کرنے سے قبل مجھے اپنے بنیادی رویے اور طریق کار کو مختصراً بیان کرنے اور پوری بے تکلفی کے ساتھ اس امر کا اعتراف کرنے کی اجازت دیجیے جسے ناقدین میرے مخصوص ”تعصب“ سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ میں کسی قسم کی نام نہاد

مقصدیت کا دعویدار نہیں ہوں۔ ماہرین نفسیات اور ماہرین سماجیات جسے "معروضیت" سمجھتے ہیں وہ شاید محض مشینوں، مشینی انسانوں اور کمپیوٹروں کی دنیا میں مل سکتی ہے انسانوں کی دنیا میں نہیں۔ لہٰذا میں ابتدا ہی میں اس امر کی وضاحت کر دینا چاہتا ہوں جس کی وجہ سے میں متعصب قرار پا سکتا ہوں۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جسے میں پسند کرتا ہوں اور اس پر فخر محسوس کرتا ہوں چنانچہ نہ اس سے مجھے احساس کراہت ہے اور نہ شرمندگی۔ اسی سبب سے میں اپنے بنیادی طریق کار کے غیر مبہم بیان سے آغاز کرتا ہوں۔ آئندہ صفحات میں جو کچھ ہے وہ پاکستانی زندگی کے مختلف شعبوں کے حوالے سے پیش کرنے کی کوشش پر مبنی ہے۔

(۱)

میرا پہلا معروضہ یہ ہے کہ ہمیں اپنے تمام مسائل کا جائزہ ایک مسلمان کے نقطۂ نظر سے لینا چاہیے۔ پاکستان میں اسلام کے بارے میں بہت کچھ طمطراق نظر آتا ہے لیکن ہمارے ملک کے سماجی معاشی پس منظر میں اسلام کے مفہوم اور پیغام کو تلاش کرنے کی بہت کم کوئی سنجیدہ کوشش کی گئی ہے۔ اکثر و بیشتر حکومت نے اسلام کو ایک ایسی چیز سمجھا ہے جس کا اس کی پالیسی اور پروگرام سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ لفظ عوام کو دھوکا دینے یا حقائق پر پردہ ڈالنے کے لیے استعمال کیا جاتا رہا ہے لیکن اس امر کو سمجھنے کی کبھی کوشش نہیں کی گئی کہ بحیثیت افراد اور بحیثیت ایک قوم ہم سے اس کے مطالبات کیا ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کو ہمارا ملجا و ماوی بنانے کے بجائے اسے ایک اچھوت شے بنا دیا گیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بیس سال قبل کے مقابلے میں آج ہم اسلامی نصب العین سے زیادہ دور ہو گئے ہیں۔ ہمارا نظریہ، ہمارے معیارات، ہمارے طور طریقے، ہماری ترجیحات، ہماری منصوبے اسلامی پس منظر سے برآمد نہیں ہوئے ہیں۔ چنانچہ آج ہم خود کو جس ابتر حالت میں پاتے ہیں اس کی ذرہ برابر ذمے داری فی الواقع اسلام پر عائد نہیں ہوتی۔

آیندہ صفحات میں جو کچھ میں نے قلم بند کیا ہے یا بالفاظ دیگر جو کچھ قلم بند کرنے کی خواہش میرے دل میں رہی ہے وہ یہ ہے کہ اسلام کے حوالے سے پاکستان کے مسائل کا جائزہ لیا جائے میں اسلام کا باقاعدہ طالب علم بھی نہیں ہوں۔ اس کام کے لیے خاصے تبحر، علمیت اور تجربے کی ضرورت ہے جس سے میں محروم ہوں۔ لیکن اپنے محدود علم اور تجربے کے باوجود میں نے ایک کوشش کا آغاز کیا ہے تاکہ حقیقی معنوں میں اہلیت رکھنے والے افراد میں ان مسائل پر کمال دسترس سے سوچنے کی تحریک پیدا ہو۔ اسی سبب سے میں طریق کار کو ازسر نو تشکیل دینے پر زیادہ زور دے رہا ہوں۔ ایک بار ہمارا بنیادی طریق کار اسلامی سانچے میں ڈھل جائے تو اس کے بعد سارے مسائل اسی طرح حل ہو جائیں گے جس طرح رات کے بعد دن آتا ہے۔ میں صورتِ حال کا عملی جائزہ لینے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہوں کہ ہم پاکستان میں راہ کا شعور تک گم کر چکے ہیں۔

زبانی خدمت کے باوجود ہم نے عملی طور پر اپنے اسلامی مقاصد کا اظہار نہیں کیا ہے۔ اس کے برخلاف ہماری قیادت گمراہ اور سراسیمہ ہے اور ہمارے عوام اس الجھی ہوئی صورتِ حال کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں۔ اگر اسلام کو فی الواقع ہمارا نصب العین تسلیم کر لیا جاتا تو عوام کے حقیقی اخلاقی، معاشی، تعلیمی اور سماجی مسائل بے توجہی کا شکار نہ ہوتے اور صورتِ حال خراب نہ ہوتی۔ اسلام کا مقصد خدا کی اطاعت کرنا اور ایک ایسے معاشرے کو تشکیل دینا ہے جہاں انصاف، اخوت اور اخلاقی محاسن پھل پھول سکیں، جہاں تعاون اور اشتراک باہمی کا جذبہ پروان چڑھ سکے اور جہاں نیکی اور سماجی بھلائی کو ہر شے سے مقدم سمجھا جائے۔ ہماری بصارت دھندلا گئی ہے، ہم اپنے مقدم فرائض سے غافل ہو گئے ہیں اور ہماری قوتِ مشاہدہ مسخ ہو گئی ہے کیونکہ ہم نے اسلامی تصورات سے اپنی وابستگی کو مستحکم نہیں بنایا ہے۔ نیز اسلام نے ہمارے مسائل کا جو حل پیش کیا ہے اس کو تلاش کرنے اور اس پر عملدرآمد کرنے کی سنجیدہ کوشش نہیں کر رہے ہیں۔

میرا دوسرا مدعا یہ ہے کہ گزشتہ متعدد برسوں کے دوران، جنھیں میں ہمارے ضائع شدہ برسوں سے تعبیر کرتا ہوں، پاکستان کی حکومتوں نے ترقی کے لیے جو لائحہ عمل اختیار کیا اور اسے نافذ کیا وہ تمام تر بنیادی طور پر غلط تھا۔ ہم نے ملک کی زراعت، تعلیم اور سماجی ترقی کو نظر انداز کر کے مغربی ممالک کے صنعتی طرز کی پیروی شروع کر دی اور اس امر پر غور تک نہیں کیا کہ ہماری صورت حال کے لیے یہ حقیقی معنوں میں کتنی مفید اور موزوں ہے۔ ان برسوں کے دوران ہم نے جو کچھ کیا ہے اسے نہ تخلیقی عمل سے کوئی واسطہ ہے اور نہ حقیقت پسندی سے۔ بلکہ دوسروں کی اندھی تقلید کی ایک غلامانہ ذہنیت کا مظاہرہ کیا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم ایک نفسیاتی مرض میں مبتلا رہے ہیں جسے بے جا احساس برتری کے نام سے یاد کیا جا سکتا ہے۔ ہم یہ سمجھتے رہے کہ ہم نام نہاد ترقی یافتہ ممالک کے سماجی معاشی ڈھانچے کی ظاہری ساخت کی نقل کر کے عظیم بن سکتے ہیں۔ ہم نے خود اپنی صورت حال کے بین حقائق کو نظر انداز کیا ہے ہم اس عظمت کی تلاش میں سرگرداں رہے جو ہمیں دوسروں میں نظر آتی رہی۔ اس نے ہماری منصوبہ بندی اور حکمت عملی کی تشکیل کو باغبانِ صحرا بنا کر رکھ دیا۔ سیدھی سادی، اظہر من الشمس اور گردو پیش کے ماحول میں نظر آنے والی چیزوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے اس کے بجائے ہم راتوں رات جدت و جدیدیت کے تمام اجزا کو حاصل کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں اور اس طرح ایک سراب کے پیچھے دوڑ رہے ہیں۔ ہم نے ایک ایسا ظاہری ڈھانچہ تیار کیا ہے جسے ملک کی معاشی اور تعلیمی بنیاد مضبوطی سے سہار نہیں سکتی ہے۔ اس ظاہری ڈھانچے کو برقرار رکھنے کے لیے ہم زیادہ سے زیادہ غیر ملکی قرضوں پر انحصار کر رہے ہیں۔ جن کا بہاؤ ہمیشہ اس ظاہری ڈھانچے کے استحکام کی سمت ہوتی ہے اور بنیاد پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی ہے۔ برائیوں کا ایک جال ہے جس میں ہم سب گرفتار ہیں۔

ہم اس پیاسے انسان کی مانند ہیں جو سمندر کا پانی پی رہا ہو۔ جتنا ہم پیتے جاتے ہیں اسی قدر ہماری پیاس بڑھتی جاتی ہے۔ اس کا سب سے خراب پہلو یہ ہے کہ قرضوں کا بوجھ اس سے بھی بڑا ہے۔ جس کی وجہ سے ہماری معاشی توانائی کی بہاریں بُری طرح ضائع ہو رہی ہیں۔

میں دراصل یہ چاہتا ہوں کہ عظمت کا ظاہری طمطراق اور مغربی نقالی کی دست نگر ترقی کا لائحہ عمل بنیادی طور پر ترک کر کے ایک ایسا طریق کار اختیار کیا جائے جو سادہ، حقیقت پسندانہ اور عمل پذیر ہو۔ زیادہ طمطراق اور شان و شوکت کے دلدادہ افراد مجھ پر "سہل پسندی" کا الزام عائد کریں گے لیکن مجھے یقیناً اس امر کا اعتراف ہے۔ کہ میری معروضات کے گرد ظاہری چمک دمک کا کوئی ہالہ نہیں ہے۔ اپنے مسائل پر درآمد شدہ طریق کار کے بجائے منطبق کرنے سے یہ معروضات سامنے آتے ہیں۔ مجھے اس جرم کا اعتراف ہے کہ میں نے ذرا مختلف معنوں میں بڑے اور پیچیدہ مسئلوں کے سادہ حل تجویز کیے ہیں۔ لیکن یہ حل "سہل پسندی" پر مبنی نہیں ہیں۔ یہ حقیقت پسندانہ اور انتہائی عملی ہیں۔ یہ پاکستان کی موجودہ صورت حال کے جائزے پر مبنی ہے یہ کسی غیر ملکی طرز سے برآمد نہیں ہوئے اور فریب خوردہ بصیرت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان میں ملکی وسائل کے زیادہ سے زیادہ استعمال اپنی عظیم افرادی طاقت اور انسانی صلاحیتوں کو مکمل طور پر فعال بنانے کی ترکیب پوشیدہ ہے۔ یہ ترقی کی ایک ایسی راہ کا واضح تعین کرتے ہیں جو ہمارے حالات سے مطابقت رکھتی ہے اور ان میں مقدم اجزا کو اس طرح مرتب کیا گیا ہے کہ معیشت میں اساسی طور پر ارتقا ہو اور اس ترقی کے ثمرات عوام الناس تک پہنچ سکیں تاکہ خود لائحہ عمل ہی میں سے جدوجہد کرنے کا جذبہ پیدا ہو۔ اب تک ہم جس طریق کار پر عمل پیرا ہیں اس نے ہمارے معاشرے کی صرف ابتدائی حدوں کو چھوا ہے اور باقی سارے میدان کو اب

تک ہاتھ تک نہیں لگایا گیا ہے۔ میں جس لائحہ عمل کی تجویز پیش کر رہا ہوں وہ معاشرے میں بنیادی انقلاب پیدا کر دے گا۔ اور اس کو اپنی ملکی بنیادوں پر ترقی کرنے کے قابل بنا دے گا اور اسے اپنی اخلاقی اور سماجی اقدار سے ہم آہنگ رکھے گا۔ اس لائحہ عمل کا انحصار مٹھی بھر افسروں، صنعتکاروں اور غیر ملکی منہ بولے رضاعی اجداد پر نہیں ہوگا۔ اس کے بجائے یہ پاکستان کے ۱۲ کروڑ عوام کو ترقی اور ارتقا کے ڈرامے کا اہم کردار بنا دے گا اور جب انہیں یہ احساس ہوگا کہ وہ ایک ترقی یافتہ، مستحکم اور اسلامی طرز پر تشکیل کردہ پاکستان کی منزل کی سمت گامزن ہیں تو وہ اس قومی جدوجہد میں صمیم قلب سے حصہ لیں گے۔ وہ اس انقلاب کے ثمرات حاصل کریں گے اور خود کو اس ترقی کا ذمہ دار محسوس کریں گے، اور خود کو اپنے پوری قوم اور سب سے بڑھ کر خدائے بزرگ و برتر کے سامنے جواب دہ سمجھیں گے۔ اسی لیے میں کسی "درآمد شدہ" لائحہ عمل کے خلاف ہوں اور ایک ایسے لائحہ عمل کی تجویز پیش کر رہا ہوں جو خود ہماری سرزمین اور روایات سے معرضِ وجود میں آیا ہو۔

یہ بنیادی معروضات ہیں جن پر میرے لائحہ عمل کی بنیاد ہے۔ اگر آپ چاہیں تو کہہ لیں کہ میرے "تعصب" کے اجزائے ترکیبی یہی ہیں۔

(۳)

مندرجہ بالا بحث سے خود بخود یہ امر واضح ہو گیا ہوگا کہ میں اپنے عہد کے کسی بھی غالب سماجی/معاشی نظام یعنی اشتراکیت سرمایہ داری یا انہی کی کسی اور شکل کو لائق توجہ نہیں سمجھتا ہوں۔ یہ دونوں ایک مادہ پرست تہذیب کی پیداوار ہیں اور دونوں اسلام کے منافی ہیں۔

اشتراکیت پر میرے اعتراضات بہت براہ راست اور واضح ہیں

(ا) اشتراکیت ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جس کی بنیاد خدا اور روح کے انکار، مذہب اور اخلاقیات کی نفی، فرد کی تخفیفِ قدر اور معیشت کی اجتماعیت پر رکھی گئی ہے۔ یہ مذہب کی مخالفت (نفئ مذہب) کا ایک نیا مذہب ہے۔ یہ اسلام کا ایک منفی متبادل ہے اسے کسی بھی طرح اسلام کا حصہ نہیں بنایا جاسکتا ہے اور ایک اسلامی معاشرہ اس لادینی اور بے خدا نظام کو اسلام کی قیمت پر کبھی تسلیم اور اختیار نہیں کرسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں کہیں اشتراکیت برسرِ اقتدار آئی ہے اس نے معاشرے اور اس کے افراد کو اسلام سے محروم کرنے کے لیے اپنی پوری قوت استعمال کی ہے۔ اسلام اور اشتراکیت ایک دوسرے کے متضاد ہیں اور بقائے باہمی کی بنیاد پر ان کا قیام ممکن نہیں۔ ایک کی فتح کا مطلب دوسرے کی تباہی ہے۔ پاکستان کو ایک مثالی اسلامی معاشرے کی تشکیل کے لیے معرضِ وجود میں لایا گیا تھا۔ اشتراکیت کو اس میں کوئی جگہ حاصل نہیں ہوسکتی۔

(ب) اشتراکیت اب محض ایک نظریہ ہی نہیں ہے۔ یہ ایک نظام ہے جو تقریباً ایک درجن ممالک میں نافذ العمل ہے۔ اس کی نعمتوں اور زحمتوں کو اب ہم بہت قریب سے دیکھ سکتے ہیں۔ گزشتہ تقریباً پچاس سال سے اس پر عمل درآمد ہو رہا ہے۔ اشتراکیت کے تحت اشیا کیا صورت اختیار کرلیتی ہیں یہ اب کوئی راز نہیں رہا ہے۔ جو چاہے دیکھ سکتا ہے کہ یہ استحصال کا کتنا بڑا عفریت بن چکا ہے۔ اس کی معیشت سرمایہ دار ممالک کی استحصال پسند معیشت سے بنیادی طور پر کسی طرح مختلف نہیں ہے۔ اس کی تنہا "خوبی" اس حقیقت میں مضمر ہے کہ یہ اپنی تحکمانہ معیشت کے ذریعے عوام کو مجبور کرسکتی ہے کہ وہ محض ایک سرمایہ دار یعنی مملکت کے لیے کہیں زیادہ مقدار میں "سرمایہ" پیدا کریں معاشی وسائل کو غصب کرنے کی کارروائی جاری رکھ سکیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ "سرمایہ داری" سے زیادہ "سرمایہ دارانہ" ہے اور بہترین ماہرینِ معاشیات نے جو تجزیہ پیش کیا ہے وہ اس نقطۂ نظر کی حمایت کرتا ہے۔ مجموعی قومی پیداوار سے متعلق سرمائے کا تناسب

جو معیشت میں سرمائے کے اضافی کردار کا ایک پیمانہ ہے، اشتراکی ممالک میں سب سے زیادہ ہے۔ برطانیہ میں اس قسم کا سرمایہ مجموعی قومی پیداوار کا ۱۶٫۳ فی صد ہے۔ دیگر سرمایہ دار ممالک میں اس کا تناسب حسب ذیل ہے۔

فرانس ۵٫۸ فی صد، اٹلی ۱۹٫۰ فی صد، امریکہ ۲۰٫۳ فی صد لیکن روس میں تشکیل سرمایہ مجموعی قومی پیداوار[1] کا ۲۵٫۲ فی صد ہے۔

اگر فاضل بجت " اس سرمائے کی علامت ہے جو اشتراکیوں کے دعوے کے مطابق استحصال کا پیمانہ ہے تو اشتراکی روس مزدوروں اور کسانوں کا سب سے بڑا استحصال کنندہ ہے اور " قدر زائد " کو ہڑپ کرنے کا سب سے بڑا مجرم ہے۔

عام آدمی کی معاشی حالت اشتراکیت کے تحت کوئی بہتر نہیں ہو جاتی ہے۔ مزدور کو اپنے مالک سے کسی قسم کی سودا بازی کا حق نہیں ہوتا۔ اسے ہڑتال کرنے یا اجرت میں اضافے کا مطالبہ کرنے کا حق نہیں ہوتا۔ روزگار کے تمام وسائل حکومت کے ہاتھوں میں ہوتے ہیں اور کوئی شخص بھی اپنے وجود و بقا کو خطرے میں ڈالے بغیر حکومت کرنے والے ٹولے کی مرضی اور ہدایات کے سامنے سر جھکانے سے انکار نہیں کر سکتا ہے۔ معاشی عدم مساوات مغربی ممالک کے برابر بلکہ اُن سے بڑھ کر ہے۔ افلاس، بے روزگاری، ناقص غذائیت، مکانات کی قلت، گندی آبادیاں، زرعی پسماندگی، سب کے سب اتنی ہی سنگین ہیں جتنی کسی اور ملک میں ہو سکتی ہیں اور اس پر مستزاد یہ ہے ہر قسم کی انسانی آزادی کو ختم کر دیا گیا ہے اور انسان کو قیدیوں اور غلاموں کی حیثیت دے دی گئی ہے۔ مملکت ایک نیا جابر ادارہ ہے۔ اشتراکی یوگوسلاویہ کے سابق نائب صدر ملاس جیلاس کے الفاظ میں

---

[1] ملاحظہ ہو " دی کمیونسٹ اکنامکس چیلنج " از ڈیوڈ انگرام، ایلن اینڈ انون، لندن ۱۹۶۵ء، صفحہ ۳۹

پارٹی کے نوکر شاہی افراد کا ایک نیا طبقہ اُبھرتا اور ایک ایسی بالادستی کے ساتھ عوام پر حکومت کرتا ہے جس کے سامنے ماضی کے تمام مطلق العنان، جابر بادشاہ یا آمر ہیچ ہیں[1]

صرف مملکت اس بات کا فیصلہ کرتی ہے کہ کسی فرد کے پاس کیا ہونا چاہیے، اس کو کیا کام کرنا چاہیے۔ نیز یہ کہ کس کام کے عوض اس کو کیا معاوضہ دیا جائے گا۔ ٹریڈ یونینیں جن معنوں میں مغرب یا ہمارے ملک میں ہوتی ہیں اس قسم کی کوئی ٹریڈ یونین اشتراکی ممالک میں نہیں ہوتی۔ نیز یہ فیصلہ بھی مملکت ہی کرتی ہے کہ کوئی شخص کیا پہنے گا، کہاں سفر کرے گا، یہاں تک کہ کوئی شخص کیا سوچے گا، کیا کھائے گا یا پیئے گا، چین والے ان سے بھی ایک قدم آگے گئے ہیں۔ ان کے لیے لازم ہے کہ وہ رات کو سوتے وقت صبح کو جاگتے وقت، دوپہر کے کھانے سے پہلے، کسی سفر پر روانہ ہونے سے پہلے، یہاں تک کہ ہوائی جہاز میں سفر کرتے ہوئے نیز "کمیون" میں روزمرہ کا کام شروع کرنے سے قبل ماؤ کے افکار و خیالات کا مطالعہ کریں۔ یہ غلامی کی ایک نئی قسم ہے، ایسی غلامی جس سے آزاد ہونے کے لیے خود اسٹالن کی بیٹی کو اس نظام سے قطع تعلق کرنا پڑا اور اس ملک سے فرار حاصل کرنا پڑا جسے اس کے باپ نے قائم کیا اور ربع صدی تک اس پر حکمرانی کرتا رہا۔

عملی اشتراکیت کی ہولناکیوں کے بارے میں اگر کبھی کسی ثبوت کی ضرورت پیش آئی تو خود اسی کے منتخب ترین فرزندوں اور دختروں کی زبان سے اسے سُنا جا سکتا ہے۔ میں ذیل میں ان میں سے محض چند شواہد پیش کر رہا ہوں۔ اس آئینے میں اشتراکیت کا صحیح رُخ دیکھا جا سکتا ہے۔

نکیتا خروشیف نے سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی کی بیسویں کانگریس (فروری ۱۹۵۶ء)

---

[1] آنکھیں کھول دینے والی یہ کتابیں ملاحظہ کیجیے! "نیو کلاس" "لینڈ وہائٹ جسٹس" اور "دی امپرفکٹ سوسائٹی"!

کو خطاب کرتے ہوئے اسٹالن کے دورِ حکومت سے اشتراکی روس کے بارے میں حسبِ ذیل جائزہ پیش کیا۔

"خصوصیت کے ساتھ اس زمانے میں (۱۹۳۵ء - ۱۹۳۷ء - ۱۹۳۸ء) سرکاری ذرائع سے وسیع پیمانے پر افراد کو کچلنے کا آغاز ہوا۔ سب سے پہلے لینن ازم کے دشمنوں یعنی ٹراٹسکی، زنیوویف، بخارن کے ماننے والوں کے خلاف اس وقت سے کارروائیاں جاری رہیں جب سے انھیں پارٹی نے سیاسی طور پر شکست دے دی تھی۔ اس کے کے بعد متعدد دیانت دار کمیونسٹوں کے خلاف بھی کارروائی کی گئی جنھوں نے لینن پسند جماعت کی خاطر ٹراٹسکی کے حامیوں اور دائیں بازو کے افراد سے عملی جنگ کی۔

"اسٹالن نے "عوام دشمن" کے تصور کا آغاز کیا۔ اس اصطلاح کے بعد خود بخود اس امر کی ضرورت ختم ہو گئی کہ کسی تنازعے سے تعلق رکھنے والے فرد یا افراد کی نظریاتی غلطیوں کو ثابت کیا جائے۔ اس اصطلاح کی وجہ سے انتہائی سنگین ظلم کو روا رکھنا، انقلابی قانونیت کے تمام اصولوں کی خلاف ورزی کرنا ممکن ہو گیا۔ یہ ہر اس شخص کے خلاف استعمال کیا گیا جس نے کسی لحاظ سے بھی اسٹالن سے اختلاف کیا ہو یا محض ان کے مخاصمانہ ارادہ کا شک ہو گیا ہو یا جو خراب شہرت کے حامل تھے۔ "عوام دشمن" کے اس تصور نے فی الحقیقت کسی بھی قسم کی نظریاتی جنگ کو یا کسی مسئلے پر یہاں تک کہ عملی نوعیت کے مسئلے پر بھی کسی کے اظہارِ رائے کو حقیقی معنوں میں ختم کر دیا۔ دراصل موجودہ علم قانون کے برخلاف، جرم کو ثابت کرنے کا صرف ایک طریقہ استعمال کیا جاتا تھا کہ مجرم خود "اقبالِ جرم" کرے۔ اور جیسا کہ بعد کی تحقیق و تفتیش سے ثابت ہوا، تمام "اقبالِ جرم" مجرموں کو جسمانی ایذائیں پہنچا کر کرائے گئے تھے۔

"اس کے نتیجے میں انقلابی نوعیت کی شرمناک خلاف ورزیاں ہوئیں اور وہ بالکل بے گناہ افراد جنھوں نے ماضی میں پارٹی کے لائحہ عمل کا دفاع کیا تھا، اس کا

شکار ہو گئے [1]

یہ خود پارٹی کے سکریٹری کا بیان ہے۔ اس کی پوری تقریر دہشت گردی اور ظلم کی کی اسی حکمت عملی کی مثالوں سے بھری ہوئی ہے۔ اشتراکیت کے تحت زندگی گزارنے والوں کا یہ مقدر رہا ہے

اب میں اسٹالن کی بیٹی سوتیلانا آلیلویوا کی تازہ ترین کتاب سے ایک اقتباس پیش کرتا ہوں، جس میں سارے سوویت نظام کا جائزہ شامل ہے۔

" دہشت گردی اور ظلم وستم کے اس نظام میں یاگودا، یزہوف، ایگرانوف اور بیریا (خفیہ پولیس کے سربراہان) میرے باپ کے لیے ناگزیر تھے۔ اور اس نے بڑی مہارت سے ان کا انتخاب کیا تھا۔ لینن اسی مقصد کے لیے زرزہنسکی کو استعمال کرتا تھا۔

" اسٹالن نے کوئی نئی چیز ایجاد یا قبول نہیں کی تھی۔ لینن سے ایک کمیونسٹ مطلق العنان نظام کو ورثے میں حاصل کرنے کے بعد وہ اس کی علامت بن گیا تھا، اس نے جمہوریت کے بغیر طاقت کے ایک نظام کو مکمل طور پر اپنی شخصیت میں ڈھال لیا۔ اس کی بنیاد لاکھوں عوام پر ظلم وستم سے عبارت تھی۔ اس عمل میں جو لوگ جسمانی طور پر زندہ بچ جاتے تھے انھیں غلاموں کی حیثیت دے دی جاتی تھی اور انھیں تخلیق یا فکر کے حق سے محروم کر دیا جاتا تھا.... مطلق العنان نظریات مطلق العنان حکومتوں کو جنم دیتے ہیں۔ اس مفہوم میں کمیونزم فاشزم سے ذرہ برابر مختلف نہیں ہے۔"

اسٹالن کی بیٹی کو اپنے ملک اپنے خاندان اور اپنے والد کے قائم کردہ نظام کو الوداع کہہ کے "بورژوا" ملک میں پناہ گزیں ہونا پڑا۔ یہ واقعہ خود اس نظام پہ ایک جامع تبصرے کی حیثیت رکھتا ہے۔

---

[1] "کمیونزم ان ایکشن": اے ڈاکومینٹری ہسٹری" صفحہ ۱۶۶ - ۱۶۷ -

اشتراکی نظام پر ایک اور تازہ ترین تبصرہ ایک ممتاز نوجوان روسی دانش ور اور ادیب اناطولی کزنیتسوف نے کیا ہے جو ایک سرکاری دورے پر لندن آئے اور اس ملک میں سیاسی پناہ حاصل کرلی۔ انھوں نے دانش وروں کی افسوسناک صورت حال کی تصویر کشی ان الفاظ میں کی ہے۔

"اگر اسٹالن مقتدر اعلیٰ ہے تو اسٹالن کی تعریف کرو۔ اگر وہ عوام کو حکم دیں کہ مکئی اگاؤ تو مکئی کے بارے میں لکھو۔ اگر انھوں نے اسٹالن کے جرائم کو طشت ازبام کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے تو اسٹالن کو طشت ازبام کیجیے۔ اور جب وہ اس پر نکتہ چینی بند کردیں تو آپ بھی بند کردیجیے۔"

اناطولی کزنیتسوف نے مزید کہا ہے کہ:۔

"غالباً اس سے زیادہ بدترین سزا کا تصور کرنا مشکل ہوگا کہ کسی شخص کو اپنی ساری زندگی خوف و دہشت اور چاپلوسی میں بسر کرنی پڑے، ہر تازہ ترین حکم کے مفہوم کو ڈر ڈر کر سمجھنے کی کوشش کرنی پڑے اور ذرا سی غلطی بھی نہ کرنے کا خوف دل میں موجود ہے اُف، خدایا!"

اناطولی کزنیتسوف نے اپنی تمام گزشتہ تصانیف سے دستبرداری کا اعلان کردیا ہے جن میں اس کی مشہور زمانہ کتابیں "بابی یار" "اَوْرَدی فائر" بھی شامل ہیں۔ کیونکہ کزنیتسوف جو کہنا چاہتا تھا اور روسی حکام نے جو کچھ اس پر مسلط کیا تھا یہ سب اُن کا آمیزہ تھیں۔ اب اس نے اپنی تمام کتابوں کو ازسرنو اس صورت میں شائع کرنے کا عہد کیا ہے جیسی کہ وہ اصل میں لکھی تھیں۔ اپنے طویل بیان کے آخر میں اس نے موجودہ انسانی معاشرے کو "پاگل، پاگل، دنیا کی ایک وحشیانہ، وحشیانہ، وحشیانہ زندگی"[1] سے تعبیر کیا ہے۔

---

[1] "دی سنڈے ٹیلی گراف" لندن ۱۰ اگست ۱۹۶۹ء

اور اگر یہ سب کچھ بھی ان لوگوں کی آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی نہیں جو اب تک مجوخواب ہیں اور حقیقتاً خود کو فریب دے رہے ہیں تو میں ذیل میں ان ممتاز روسی دانش وروں کے خطوط سے دو اقتباسات پیش کرتا ہوں جو اب بھی سوویت روس میں ہیں اور اس نظام پر تنقید کرنے کی سزا بھگت رہے ہیں۔

روس کے عظیم ترین بقیدِ حیات ناول نگار الیگزینڈر سالزہینتسین نے اپنے ناولوں خصوصاً "اے ڈے ان ڈی لائف آف ایوان ڈینیسووچ" (ایوان ڈینیسووچ کی زندگی کا ایک دن) میں جو پہلے روس میں اور بعد میں مغرب میں شائع ہوا، دہشت و استبداد پر مبنی اشتراکی نظام کی تصویر کشی کی جرات کی ہے۔ اس نے اپنی تنقید کو بعد کی تصانیف "کینسر وارڈ" اور "دی فرسٹ سرکل" میں جاری رکھا۔ روس میں ان دونوں کی اشاعت کی اجازت نہیں دی گئی اور بعد میں یہ مغرب میں شائع ہوئی ہیں۔ اب اسے روسی ادیبوں کی انجمن سے خارج کر دیا گیا ہے۔ وہ اب بھی روس میں ہے اور ادیبوں کی انجمن کے نام ایک کھلا خط میں اس نے لکھا ہے۔ [1]

"یہ امر شرمناک ہے کہ تم خود اپنے محسنوں کو اس طرح قدموں کے نیچے روند دیتے ہو۔ تم نے میری غیر موجودگی میں مجھے رکنیت سے خارج کر دیا ہے۔ جیسے وہاں کوئی آگ لگی ہو۔ یہاں تک کہ مجھے کوئی اطلاع نامہ یا تار بھی نہیں بھیجا گیا" یہاں تک کہ مجھے چار گھنٹے کی وہ مہلت بھی نہیں دی گئی جو مجھے ریازن سے آنے کے لیے ضروری تھی۔

"گھڑی کا آئینہ صاف کر لو۔ تمہاری گھڑیاں ہمارے وقت کے مقابلے میں سست رفتار ہیں۔ ان بھاری پردوں کو ہٹا دو جو تمہیں اس قدر پسند ہیں۔ تمہیں شبہ تک نہیں ہوتا کہ باہر دن نکلا ہوا ہے۔ یہ بہرے دن کا زمانہ نہیں ہے۔ یہ وہ تاریک عہد نہیں ہے جس میں

---

[1] "دی ٹائمز" لندن ۵ ۲ نومبر ۱۹۶۹ء

کوئی راہ فرار نہ تھی جس میں تمہیں اخماتووا کو برادری سے خارج کرکے مسرت ہوئی تھی اور یہ دور وہ خوف وہراس کا دور بھی نہیں ہے جس میں تم نے بیک جنبشِ لب یا سترزک کو برادری سے خارج کر دیا تھا۔ کیا یہ شرمندگی ہی تمہارے لیے کافی نہیں تھی....؟

"تم ہماری سوویتا کے لیے جو سخت علیل ہے، کوئی تعمیری تجویز کوئی بہتر چیز اس وقت پیش کرنے سے قاصر ہو، جب تک وہ تمہاری نفرت آمیز ہوشیاری پر مبنی نہ ہو اور اس امر پر مبنی نہ ہو کہ "پکڑ لو۔ جانے نہ پائے۔"

"کیا ہم سے پچاس سال قبل یہ وعدہ نہیں کیا گیا تھا کہ اب کبھی کوئی خفیہ حکمت عملی، خفیہ مذاکرات، خفیہ اور ناقابلِ فہم تقرری اور سبکدوشی نہیں ہوگی نیز یہ کہ ہر چیز پر عوام کھلے عام بحث کریں گے؟

"دشمنوں کو خبر ہو جائے گی" یہی تمہارا عذر ہے۔ ابدی اور مستقل "دشمن" تمہاری کارروائیوں کے وجود اور خود تمہارے وجود کا آسان جواز مہیا کرتے ہیں۔

"لیکن تم "دشمنوں" کے بغیر کیا کرو گے؟ تم "دشمن" کے بغیر زندہ تک نہیں رہ سکتے؛ منافرت، منافرت کلی طور پر نسلی منافرت کے مساوی ہے اور یہ تمہارے بنجر ماحول پر چھا چکی ہے....."

ایک اور ممتاز نوجوان ادیب اینڈریل امرلک، نے اناطولی کزنیتسوف کو روس سے ایک خط لکھا ہے۔ اس خط کے بعض اقتباسات پڑھنے اور غور و فکر کرنے کے لائق ہیں سے۵

"۱۹۶۱ء میں دانش وروں کی ذہنی کیفیات کا ایک عام جائزہ لکھنے کے لیے مجھے کے جی۔ بی۔ میں بڑی شائستگی سے مدعو کیا گیا تھا اور میں نے اسی شائستگی سے انکار کر دیا۔

سے۵ ڈیلی ٹیلی گراف۔ لندن ۲۴ نومبر ۱۹۶۹ء

جس کے بعد یہ معاملہ ختم ہو گیا۔

"۱۹۶۳ء میں مجھے رات کے وقت لُبیانڈا لے جایا گیا اور ایک امریکی سفارتی نمائندے کے خلاف یہ رپورٹ لکھنے کا حکم دیا گیا کہ اس نے مجھے اور دیگر سوویت شہریوں کو شعوری طور پر نظریاتی تبدیلی کی ترغیب دی ہے۔"

"اگرچہ انھوں نے مجھے اس وقت مجرمانہ کارروائیوں کی دھمکی دی لیکن میں نے دوبارہ انکار کر دیا۔ ۱۹۶۵ء میں میں نے ان سے قطعاً بات کرنے سے انکار کر دیا جس کے نتیجے میں مجھے جلاوطن کر کے سائبیریا بھیج دیا گیا۔"

"لیکن اہم بات یہ ہے کہ اس ملک میں رہنے اور وہ سب کچھ لکھنے اور کرنے سے جو میں صحیح سمجھتا ہوں، کسی بھی لمحے مجھے دوبارہ جیل میں ڈالا جا سکتا ہے یا کوئی اور سلوک میرے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔"

"آج بھی، حکومت شاید نہ صرف اجزدا" بلکہ بیشتر خوف کے سرمایے کے اس سود پر گزارا کر رہی ہے جو اس دوران میں اکٹھا کیا گیا ہے۔

"اور یہ صرف کے۔جی۔بی کا سوال نہیں ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ سوویت زندگی اور سوویت تعلیم کی تمام تر فضا ایسی ہی ہے کہ ہر شخص کے لیے کے۔جی۔بی سے گزرنا ضروری ہے اور اسی قسم کے روابط قائم کرنا ضروری ہے جیسا کہ تم نے لکھا تھا۔۔۔

"آپ یہ باور کرنا چاہتے ہیں کہ آپ ظلم وستم کا شکار رہیں۔ لیکن میرے خیال میں کوئی ظلم وتشدد ان کے بغیر موثر نہیں ہو سکتا جو اس کے آگے سر جھکانے کو تیار رہیں۔"

"کبھی کبھی مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے سوویت کے "تخلیقی کام کرنے والے دانش ور ـــــ یعنی وہ لوگ جو ایک چیز سوچنے، دوسری چیز کہنے اور کسی تیسری چیز پہ عمل کرنے کے عادی ہیں ـــــ مجموعی طور پہ اس حکومت سے زیادہ ناپسندیدہ ہیں جس نے انھیں تشکیل دیا ہے۔"

"ریاکاری اور اس سے وابستہ تمام چیزوں کو تسلیم کرنا اس حد تک اس طبقے کا حصہ بن چکی ہے کہ باعزت طریقے سے عمل کرنے کی کسی بھی کوشش کو یا تو یہ عیاری سمجھتے ہیں یا پاگل پن....."

"مغرب میں آپ سے یہ سوال اکثر کیا جاتا ہے کہ اگر حکومت اس قدر خراب ہے تو آپ روس والے اسے بدل کیوں نہیں دیتے، لیکن یہ سوال آپ کے بھولپن پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔"

"میں اس کا جواب یوں دوں گا۔ صورت حال یہ نہیں ہے کہ لوگ حکومت کو اس لیے نہیں بدلتے کہ حکومت اچھی ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم خود خراب ہیں۔

"ہم مجہول، بے خبر اور خوف زدہ ہیں۔ ہم ازمنۂ قدیم کی داستانوں سے خود کو دھوکا دیتے ہیں اور نوکر شاہی طور طریقوں سے ہم نے خود کو وابستہ کر رکھا ہے۔"

"ہم اپنے فعال ترین شہریوں کو تباہ کر دینے کی اجازت دے دیتے ہیں۔ ہماری اکثریت اپنی صورت حال سمجھنے سے قاصر ہے۔ ہمارا دانش ور طبقہ ضمیر فروش، خوف زدہ اور اخلاقی معیار سے عاری ہے....."

"بیباک دانش ور آج بھی روس میں رہتا ہے۔ لیکن اس کی کتابیں، مضامین اور افسانے روس میں شائع نہیں ہوتے ہیں۔ اسے خفیہ پولیس کا ہر وقت خیال رہتا ہے۔ "کیا روس ۱۹۸۴ء تک باقی رہے گا" نامی تصنیف کے مسودے کو طباعت کی غرض سے مغرب بھیجنے کا تازہ ترین جرأت مندانہ اقدام کرنے کے بعد اسے اپنی گرفتاری کا انتظار ہے

اور اگر خود میرا پیش کردہ ثبوت کسی قابل ہو سکتا ہے تو میں روس میں خود اپنے تجربے کے بارے میں کچھ عرض کروں۔ جب میں ۱۹۵۴ء میں روس کے دورے پر گیا تو میں نے ایک کارخانہ کے منیجر سے دریافت کیا کہ وہاں کے مزدور ہڑتال اور مطالبات کرتے ہیں۔ اس نے یہ جواب دیا کہ روس میں ہر چیز مملکت ہے لہٰذا اس قسم کی ہڑتالوں اور مطالبات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جو ایک سرمایہ دار ملک میں ہوتے ہیں۔ میں نے یہ

سوال کیا کہ کیا اس کا مطلب یہ نہیں کہ مزدور بھی ریاست کی ملکیت ہیں لہٰذا وہ کسی مطالبے کے حقدار نہیں بلکہ انھیں جو کچھ دیا جاتا ہے اس پر قانع اور مطمئن ہونا پڑتا ہے۔ اس بات کا منیجر نے کوئی جواب نہیں دیا اور گفتگو کا موضوع تبدیل کر دیا۔ بعد میں میری ترجمان نے جو خفیہ پولس کی ایجنٹ تھی مجھے بتایا کہ میں اپنے میزبان ملک سے بہت ناشائستگی سے پیش آتا ہوں۔ میں نے یہ کہہ کر ان کے اضطراب میں اور اضافہ کر دیا کہ آپ پاکستان تشریف لائیے اور جو سوال آپ چاہیں کیجیے۔ میں نے مزید کہا کہ وہ جس چیز کو بھی تنقید کے قابل سمجھیں ہم اس پر برسرِ عام تنقید کا خیر مقدم کریں گے۔ میری رہنما کچھ چراغ پا ہو گئی اور اس نے مجھ سے کہا "تمھیں ہمارا ملک پسند نہیں ہے۔ ہے نا؟" میں اسے یہ بتائے بغیر نہیں رہ سکا کہ میں بلاشبہ اس کے آمرانہ نظام کو پسند نہیں کرتا ہوں اگرچہ مجھے روسی عوام سے کوئی نفرت نہیں ہے۔ اس کے بعد اس نے مجھ سے موضوع تبدیل کرنے کی درخواست کی چنانچہ ہم نے ایسا ہی کیا۔ بعد میں اسی دن جب اس نے دیکھا کہ میں اپنے "مووی کیمرہ" سے تصویریں لے رہا ہوں تو اس نے دوسرے مناظر کے علاوہ روسی شہر کی گندی بستیوں کی فلم کھینچنے سے مجھے منع کر دیا۔ میں نے پھر اس سے جرح شروع کر دی اور کہا کہ میں ایک سرکاری مندوب ہوں اور جب تک مجھے کیمرہ استعمال نہ کرنے کے سلسلے میں کوئی تحریری سرکاری حکم نہیں ملے گا میں اپنا کیمرہ استعمال کرنے اور اس کی زبانی ہدایات پر عمل نہ کرنے میں آزاد ہوں۔ روس سے روانہ ہوتے وقت ہوائی اڈہ پر انھوں نے مجھے ایک تحریری قانون دکھایا جس کی رو سے بغیر دھلی ہوئی فلم کو روس سے لے جانا ممنوع تھا۔

انھوں نے مجھ سے میری فلمیں اور پتہ لے لیا اور وعدہ کیا کہ دھونے کے بعد وہ فلمیں مجھے بھیج دی جائیں گی۔ انھوں نے اپنا وعدہ پورا کیا لیکن ذرا سے فرق کے ساتھ مجھے وہ فلمیں موصول ہوئیں جنھیں بالکل صاف کر دیا گیا تھا۔ لیکن کیا آپ کسی کے ذہن

ہے اس کے تاثرات بھی صاف کر سکتے ہیں؟ میں اب تک سوچتا ہوں۔

یہ ہے عملی اشتراکیت کی تصویر۔ مجھے یقین واثق ہے کہ اگر اشتراکیت کے حقیقی مقاصد کو وہ پوری طرح سمجھ لے تو کوئی مسلم معاشرہ بھی اس نظام کو اپنا کر خودکشی کا مرتکب ہونا گوارہ نہیں کرے گا۔ صرف ان خوبصورت نعروں اور بندھے ٹکے الفاظ کو سننا کافی نہیں ہے جو روس اور چین کے مقلدین رٹتے ہوئے ہیں بلکہ انسانی محکومی اور زوال کے ان تلخ حقائق کو سمجھنا چاہیے جو اشتراکی ممالک کے عوام الناس کی تقدیر بن چکے ہیں۔

ایک تیسرا رُخ بھی ہے جسے ہرگز نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ خود ہمارے نظام میں سنگین کمزوریاں ہیں اور اس مقالے کا مقصد ان کو منظر عام پر لانا ہے۔ مغربی ممالک کی بھی بڑی بڑی ناکامیاں ہیں اور میں مغربی سرمایہ داروں اور لادینی جمہوریت کا بھی اتنا ہی شدید مخالف ہوں جتنا مادی اشتراکیت کا۔ لیکن اس حقیقت کو تسلیم کرنا چاہیے کہ تمام ناپسندیدہ پہلوؤں کے باوجود کم از کم یہ امکان موجود ہے کہ صدائے احتجاج بلند ہو سکتی ہے اور نظام کو تبدیل کرنے کی جدوجہد کی جا سکتی ہے۔ اس میں مصیبت زدہ انسانیت کی امید مضمر ہے۔ لیکن اشتراکیت میں ایسا نہیں ہے۔ ایک بار اشتراکی آمریت قائم ہو جائے تو تبدیلی کے امکانات ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ اگر ایک بار وہ اقتدار کی کرسی پر قابض ہو جائیں تو پھر وعدوں کی تکمیل کے بارے میں عوامی جواب طلبی یا ذمہ داری کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا ہے۔ اس نئی غلامی میں نہ صرف افراد بلکہ پوری اقوام کو بے بس کر دیا جاتا ہے۔ وہ آزاد ہونا بھی چاہیں تو آزاد نہیں ہو سکتے۔ ہنگری نے ۱۹۵۶ء میں روس کی سرپرستی سے آزاد ہونا چاہا لیکن سوویت ٹینکوں کے سوا اُسے کچھ حاصل نہ ہوا۔ ساری قوم، اس کی ساری قیادت یہاں تک کمیونسٹ پارٹی بھی اشتراکی "سرپرستی" سے خود کو آزاد کرنا چاہتی تھی لیکن وہ ایسا نہ کر سکی۔ چیکوسلواکیہ نے ۱۹۶۸ء میں اس قسم کی ایک کوشش ذرا زیادہ مناسب انداز میں کی لیکن اسے بھی نقصان اٹھانا پڑا۔ روسی فوجیں

وہاں بہ جبر داخل ہوگئیں اور اسے اشتراکیت کے نام پر فتح کر لیا۔ ان سب اقدامات کو اب اس کلیے میں ضم کر لیا گیا ہے جسے برزنیف کے نظریۂ محدود خود مختاری کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک بار اگر آپ کا ملک اشتراکی بن جائے تو آپ کبھی اشتراکیت سے فرار حاصل نہیں کر سکتے۔ اگر آپ اپنا کوئی الگ راستہ یہاں تک کہ خود اشتراکیت کا کوئی الگ راستہ بنانا چاہیں تو آپ کو اس کی بھی اجازت نہیں دی جائے گی۔ اسے "عالمی اشتراکیت" کے مقاصد سے غداری قرار دیا جائے گا اور دنیا کے دوسرے تمام اشتراکی ممالک کو "حق" حاصل ہوگا کہ آپ پر حملہ کر دیں اور آپ کو اشتراکیت کی خاطر فتح کر لیں۔ اشتراکیت کا مطلب داخلی اور خارجی طور پر ایک مستقل محکومی ہے۔ انہی تلخ حقائق کی وجہ سے میں اشتراکیت کے خلاف ہوں اور اس کی طرف مائل ہونے کو میں تباہی اور قومی خودکشی کی طرف مائل ہونے کے مترادف سمجھتا ہوں۔

جتنا میں اشتراکیت کے خلاف ہوں اتنا ہی مغرب کی مادی جمہوریت کا بھی مخالف ہوں۔ حقیقتاً یہ دونوں نظام لادینی مغربی تہذیب کی پیداوار ہیں اور ایک ہی سکے کے دو رُخ ہیں۔ اور چونکہ میں سمجھتا ہوں کہ ایک سچے مسلمان کو تمام مغربی تہذیب کا باغی ہونا چاہیے اس لیے مجھے مغربی سرمایہ داری سے نفرت بھی کچھ کم نہیں ہے۔

"سرمایہ داری" اور "نجی ملکیت" ایک دوسرے کے مترادف نہیں ہیں۔ ان مسائل کو خلط ملط کرنے کی گھناؤنی سازش کی جاتی رہی ہے اور یہ امر حیران کن ہے کہ سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں کے مغربی حامی اور مخالفین اس جرم کے مرتکب ہوئے ہیں۔ سرمایہ کار، دانشور اور اخبار نویس عوام کو فریب دینے کے اس جرم میں سب برابر کے شریک ہیں۔ واضح فکر پیدا کرنے کے لیے اس سازش کو بے نقاب کرنا ضروری ہے۔

"تہذیب کی سمت قدم اٹھاتے وقت انسان نے سماجی معاشی تنظیم کی جو ابتدائی صورتیں اختیار کی تھیں ۔ نجی ملکیت ان میں سے ایک ادارہ ہے ۔ یہ تقریباً اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ روئے زمین پر انسان کا وجود ۔ خاندان کا ادارہ غالباً دوسرا ادارہ ہے جو اتنی قدامت اور انسانی معاشرے سے مسلسل وابستگی کا دعویٰ کر سکتا ہے ۔ نجی ملکیت سرمایہ داری کی پیداوار نہیں ہے ۔ یہ ماقبل سرمایہ داری موجود تھی اور اشتراکیت کی مکمل فتح کے بعد بھی موجود ہے ۔[1]

سرمایہ داری اور اشتراکیت نے اپنے اپنے فلسفہ اور اقدار کے مطابق نجی ملکیت کے ادارے کو "استعمال" کیا ہے ۔ یہ باور کرانا غلطی اور بددیانتی ہے کہ نجی ملکیت سرمایہ داری کا دوسرا نام ہے اور یہ کہ اشتراکیت اس کی مکمل نفی ہے ۔

تمام مغربی نظریات کی سب سے بنیادی ناکامی یہ ہے کہ وہ انسان کو مطالعے کا مرکز ماننے سے انکار کرتے ہیں اور سماجی حالات کے تجربے، تشخیص اور پیش گوئی کی جدوجہد میں مکمل طور پر سماجی "ہیئتوں" اور "اداروں" پر اپنی توجہ مرکوز کرتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی مسائل کو ان کے انسانی پس منظر میں سمجھنے کے بجائے وہ محض ادارہ جاتی طاقتوں پر غور

---

[1] اس امر کا ذکر نامناسب معلوم ہوگا کہ سوویت روس کے عوام نہ صرف گھریلو ساز و سامان اور اشیائے صرف بلکہ چھوٹے چھوٹے کھیتوں کے بھی مالک ہو سکتے ہیں ۔ جن میں خاندان کے لوگ کاشت کر سکتے ہیں اور جن کی پیداوار فیکٹریوں میں فروخت کی جا سکتی ہے اگرچہ زرعی زمین کا محض ۴ء۲ فی صد اس قسم کے نجی کھیتوں پر مشتمل ہے لیکن وہ مجموعی زرعی پیداوار کا ۳۲ فی صد اور مجموعی مویشیوں کا ۴۰ فی صد پیدا کرتے ہیں ۔ لوگ اپنے نجی سرمایے کی بچت کر سکتے ہیں اور اسے جمع کر سکتے ہیں اور حکومت کے سود والے بانڈ کسی بھی مقدار تک خرید سکتے ہیں ۔ روس میں لوگوں کے پاس اس قسم کے بانڈ ہیں روس کے قانونِ وراثت کے تحت یہ نجی ملکیت وارثوں کو وراثت میں مل سکتی ہے اس حد تک نجی ملکیت اشتراکیت میں موجود ہے ۔ ملاحظہ کیجیے ۔ فرینک اوبرین کی "کرائسس ان ورلڈ کمیونزم (عالمی کمیونزم کا بحران) اور لین یو تانگ کی "دی سیکریٹ نیم (خفیہ نام)

کرتے ہیں اور یہ سوچتے ہیں کہ سماجی بستیوں کو از سرِ نو مرتب کر کے صورت حال کو بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ سرمایہ داری کی برائیوں کے ضمن میں انھوں نے "نجی ملکیت" کو قربانی کا بکرا بنایا ہے اور "قومی ملکیت" میں لے لینے کا "نسخہ" تجویز کیا ہے۔ لیکن نہ تشخیص صحیح ہے اور نہ علاج اور یہی وجہ ہے کہ مرض پختہ تر ہوتا جا رہا ہے۔ البتہ اس کے اظہار کے نئے راستے پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ آیا یہ مسخ شدہ اندازِ نظر محض مادی تہذیب کے پیدا کردہ باطل رویوں کی پیداوار ہے جیسا کہ پٹرِیم سوروکن[5] اور آلڈس ہکسلے جیسے افراد نے رائے ظاہر کی ہے۔ یا یہ دونوں نظاموں کے اپنے اپنے ذاتی مفادات کے مابین ایک سازش کا نتیجہ ہے کہ صحیح مسئلہ ہمیشہ گنجلک ہی رہے۔ بہر حال یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ نجی ملکیت ایک ایسا کھلونا بنی ہوئی ہے جس سے ایک کھیلتا ہے اور دوسرا اس کی مذمت کرتا ہے۔

سرمایہ داری بھی زندگی کا ایک نقطۂ نظر پیش کرتی ہے۔ یہ خاص قسم کے رویے تخلیق کرتی اور ایسے سماجی اور معاشی اداروں کی تجویز پیش کرتی ہے جو اس کے مقاصد کو پورا کر سکتے ہوں۔ اس کی بنیادی خصوصیت امیروں کے خدا کی عبادت کرنا ہے۔ یہ بھی خدا کے اقتدارِ اعلیٰ مذہب یا کسی بھی ضابطۂ اخلاق کا انکار کرتی ہے۔ یہ صرف ایک چیز کا پرچار کرتی ہے۔ کسی بھی طریقے سے امیر بن جاؤ۔ دولت کو جس طرح چاہو استعمال کرو۔ تمام اخلاقی اصولوں اور سماجی ذمہ داری کے قواعد کو نظر انداز کرو۔ یہی رویہ دراصل ہر قسم کی نا انصافی اور استحصال کا سرچشمہ ہے۔ مذہب اس کا پہلا شکار ہے۔ کیونکہ سچا مذہب انسانی رویے کے اخلاقی حدود معین کرتا ہے اور سماجی تعلقات میں انصاف کی ضمانت دیتا ہے۔ مذہب اور اخلاق کے انحطاط کے نتیجے میں مغرب

---

۵ ملاحظہ کیجیے۔ سوروکن کی "دی کرائسس آف اور ایج" (ہمارے عہد کا بحران) اور آلڈس ہکسلے کی "اینڈز اینڈ مینس" (مقاصد اور ذرائع)

میں سرمایہ داری کا آغاز اور فروغ ہوا - سرمایہ داری اور سامراجیت دونوں مذمت کے مستحق ہیں - اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ یہ مادیت اور استحصال کے نظریے میں پروان چڑھے ہیں اگرچہ تمام تر مغربی معیشت بنیادی طور پر سرمایہ داری فلسفہ کے زیر اثر ہے تاہم یہ معاشی رویے بلکہ دراصل معاشی، سماجی، سیاسی، قومی اور بین الاقوامی غرض ہر رویے میں اصولوں اور قدروں کی برتری کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ حلال اور حرام کا تصور ہی اس کے لیے اجنبی ہے۔ اسی طریق فکر نے انسان کو درندہ بنا دیا ہے۔ اسی لیے نجی ملکیت کے تصور کو اس کے دوسرے جزو یعنی سماجی ذمہ داری سے منقطع کر دیا گیا ہے، "منافع خوری" کا رجحان "ذاتی ترقی" کا مترادف بن گیا ہے۔ "معاشی تعاون" زوال پذیر ہو کر "استحصال" میں تبدیل ہو گیا ہے۔ تجارتی ادارے، صنعت اور معیشت سے متعلق انسانی تعلقات کو محض لین دین کا رشتہ بنا دیا گیا ہے۔ سرمایہ داری بحیثیت ایک نظام اس لیے قابلِ مذمت ہے کہ اس نے ان طریقوں اور اصولوں کی ہتک کی ہے جو انسان نے عظیم جدوجہد اور ایثار کے بعد تشکیل دیئے تھے اور انھیں اپنے حرص پسندانہ مقاصد کے لیے استعمال کیا ہے بحیثیت ایک مسلمان میرا عقیدہ ہے کہ معاشی زندگی کو اسلام کے اخلاقی اصولوں کے تابع ہونا چاہیے۔ یہ کہ زندگی صرف امیروں کی نسل کے لیے نہیں بنائی گئی ہے۔ یہ کہ ملکیت ایک وقف ہے جسے خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بتائے ہوئے انفرادی اور سماجی حدود کے اندر رہ کر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یہ کہ تمام انسان آپس میں برابر ہیں اور انسان کی قدر و قیمت کا اندازہ اس کے بٹوے کے وزن سے نہیں بلکہ اس کی شخصی قابلیت اور کردار سے لگانا چاہیے۔ یہ کہ تمام افراد کو نشو ونما اور ترقی کے مناسب مواقع مہیا کرنے چاہئیں۔ یہ کہ دولت صرف جائز ذرائع سے کمائی جا سکتی ہے اور دولت اسلام کے بتائے ہوئے طریقوں سے خرچ کی جانی چاہیے۔ اور سماجی و معاشی تعلقات کو انصاف اور دیانت داری پر مبنی ہونا چاہیے اور یہ کہ کسی شخص کا استحصال نہ کیا جائے یا اُسے کوئی ناجائز کام کرنے پر مجبور نہ کیا جائے اور سب کو آزادی، عزت اور وقار کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا موقع ملنا چاہیے۔ سب سے

بڑھ کر یہ کہ معاشرے کے تمام انسانوں کے مابین اخوت اور یک جہتی کے رشتوں کو فروغ دیا جائے اور انہیں مستحکم کیا جائے۔ تاکہ وہ اسلام کے بتائے ہوئے اور اعلیٰ اقدار پہ زندگی کے لیے مل جل کر کام کر سکیں۔ للٰذا میں بالکل انہی وجوہ کی بنیاد پر سرمایہ داری کی مخالفت کرتا ہوں جن کی بنیاد پہ اشتراکیت کی کرتا ہوں۔ یہ دونوں ہمارے مذہب کے خلاف ہیں۔ دونوں زندگی کو محض مادیت پسندانہ زاویوں سے دیکھتے ہیں۔ دونوں عملی میدان میں ناکام ہو چکے ہیں اور ایسا معاشرہ تخلیق کرنے سے قاصر ہیں جہاں انسان ایک ایسی زندگی بسر کر سکیں جس میں مکمل آزادی، اخوت، انصاف اور نیکی کی ضمانت موجود ہو۔ میں گزارش کروں گا کہ اس قسم کی زندگی صرف اسلامی سماجی نظام کے تحت بسر کی جا سکتی ہے اور یہی وہ چیز ہے جس کے قیام کے لیے ہمیں جدوجہد کرنا چاہیے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اب میں نے اپنے بنیادی رویے اور مجموعی لائحہ عمل کو بہت واضح کر دیا ہے۔ ان تصورات کے ساتھ میں نے قومی زندگی کے ان شعبوں سے بحث کی ہے جن میں میرے خیال کے مطابق انقلابی تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔

اس مختصر کتابچے میں جن موضوعات کو میں نے اُٹھایا ہے وہ یہ ہیں۔

"ہماری زراعت میں انقلابی تغیر کرنا"۔ "ہمارے تعلیمی نظام کی از سرِ نو تشکیل"۔ "ہماری صنعتی پالیسی پر از سرِ نو غور و خوض کرنا" "ہمارے کھڈی اور گھریلو صنعتوں کو مدد دینا اور چھوٹے صنعتی یونٹ قائم کرنا۔ بدعنوانیوں اور اسمگلنگ کے خاتمے کے ذریعے قومی وسائل کو تباہی سے محفوظ رکھنا۔ عوام کو ان کی روزمرہ زندگی میں حقیقی سماجی تحفظ اور سکون مہیا کرنا اور پوری قوم کو اس بات کے لیے تیار کرنا کہ جارحیت کی صورت میں وہ پاکستان کے دفاع کے لیے کھڑی ہو جائے۔

اس امر کو قارئین کے لیے اور قابلِ فہم بنانے کے لیے کہ میری ناچیز رائے میں ہم کیا حاصل کر سکتے ہیں اور اس کا ہمارے مسائل کی نوعیت پہ کیا اثر ہو گا۔ اپنے مجموعی قومی

مسائل کی روشنی میں میں نے ہر "اہم مسئلے" کو اس کی مناسب جگہ دے دی ہے۔

ترجیحات کے مجوزہ معیار کی روشنی میں تصویر کچھ اس طرح ابھرتی ہے:۔

دفاع	۲۰
خوراک و زراعت	۱۵
بدعنوانی کا انسداد	۱۵
تعلیم	۱۴
مکانات	۱۱
صنعت	۱۰
اسمگلنگ کی روک تھام	۵
دیگر امور	۱۰

میزان ۱۰۰

میرے خیال میں دفاع کی سب سے زیادہ اہمیت ہے۔ اسی لیے میں نے اسے سب سے اعلیٰ مقام دیا ہے یعنی ۲۰ فیصد۔ اگر ہم اپنی تمام کوتاہیوں کے ساتھ زندہ و موجود رہے تو کسی بھی اچھی اور مخلص حکومت کے ذریعے انھیں دور کرنا ہمارے لیے ممکن ہو سکے گا۔

دفاع کے بعد خوراک کو اہمیت حاصل ہے۔ ہماری زمینیں ہمارے لیے "خدا کے عطا کردہ قدرتی کارخانے" ہیں اور اگر ان کی مناسب دیکھ بھال کی جائے اور زراعت کے جدید طریقے اختیار کیے جائیں تو ہم اس قدر پیدا کر سکتے ہیں کہ ہم غذا کی قلت کے اندیشے سے نجات حاصل کر کے اتنا بچا سکتے ہیں کہ زرِ مبادلہ کمانے کے لیے اسے برآمد کریں۔ بدعنوانی کا انسداد (اینٹی کرپشن) تیسرے مرحلے پر آتا ہے اور دفاع و خوراک کے بعد اس کی سب سے زیادہ اہمیت ہے۔ اگر ہم اس "اپاہج بنا دینے والی خرابی" کو ختم کر سکیں

اور اس کام کا بیڑا اٹھالیں تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ قومی کامرانی اور خوشحالی کے اعتبار سے اس کے نتائج بھی ویسے ہی برآمد ہوں گے جیسے زراعت میں انقلابی تبدیلی لانے سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ اس کے بعد تعلیم کی باری آتی ہے۔ صحیح تعلیم ہی ایک آدمی کو انسان اور اس سے بڑھ کر یہ کہ ایک سچا مسلمان بناتی ہے تعلیم کو مقدار اور معیار ہر دو اعتبار سے جامع ہونا چاہیے۔ اس کے بعد عمارات کی تعمیر کا مسئلہ آتا ہے۔ جیسا کہ قارئین محسوس کریں گے اسے تعلیم سے کم تر لیکن صنعت سے برتر مقام دیا گیا ہے۔ افراد کو تعلیم دیجیے تو وہ انتہائی نامساعد حالات کے باوجود وقت آنے پر اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جائیں گے۔ لہٰذا تعلیم مکانات سے زیادہ اہم ہے۔ لیکن اس کے بعد صنعت کی باری آتی ہے۔ یہ بالخصوص عالمی حالات کے پیشِ نظر اپنی ایک جداگانہ اہمیت رکھتی ہے۔ لیکن پائیدار صنعتی ترقی اسی صورت میں ممکن ہے جب ہمارے پاس مضبوط سماجی معاشی بنیاد ہو۔ اور یہ صرف زراعت، تعلیم، اخلاق اور کینے کی تعمیر سے متعلق انقلابی تبدیلیوں کے ذریعے حاصل ہو سکتی ہے۔ صنعت ہماری مزید نشوونما میں مدد دے گی اور اس کو نقصان پہنچانے والا عنصر نہیں بنے گی۔ میں نے اسمگلنگ کے انسداد کو علیحدہ خانے میں رکھا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ ایک دیانت دار حکومت کے لیے اس پر عمل کرنا سب سے زیادہ آسان کام ہے اور کم سے کم مدت میں اس کے نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ یہ ایک ایسا شگاف ہے جسے طاقتور ہاتھ ہی بند کر سکتا ہے۔ ہمارے باقی ماندہ قومی مسائل کو یکجا کر دیا گیا ہے اور اندازہ یہ ہے کہ ہمارے ترجیحات کے معیار کی روشنی میں یہ ہمارے مسائل کوئی دس فیصد کے قریب ہیں۔

"مواصلات"۔۔۔ خصوصاً سڑکوں اور پلوں کی تعمیر کو علیحدہ خانے میں رکھنے سے میں نے دانستہ گریز کیا ہے۔ جرمنی کی تعمیرِ نو کے منصوبے میں ہٹلر بہت اچھے مواصلاتی نظام خصوصاً سڑکوں کی تعمیر پر توجہ دے رہا تھا۔ حکومت اس مقصد کے لیے خاصی رقوم مختص کرتی اور شکر کے کارخانے جیسے کارخانوں کے پاس سڑکوں کی تعمیر کے لیے کثیر رقوم

ہوتی ہیں۔ لیکن اول الذکر میں بدعنوانیوں کی وجہ سے بہت کچھ خامی رہ جاتی ہے جبکہ موخرالذکر صورت کو بغیر کسی وجہ کے غیر معینہ مدت سے معرضِ التوا میں ڈالا جا رہا ہے۔ شاید کہیں کوئی شخص کارخانوں اور گنے کے سپلائروں کے فنڈ دینے کے لیے کارخانوں سے کوئی فی صد کمیشن مقرر کرانے کے لیے اجتماعی سودا بازی کا انتظار کر رہا ہے! اس اہم مسئلے کو "صنعت" اور "بدعنوانیوں کے انسداد" کے شعبوں سے رجوع کیا جا سکتا ہے۔

اگرچہ میں ابتدا ہی سے اس امر پر زور دے رہا ہوں کہ ہمارا حقیقی مسئلہ اخلاقی اور نظریاتی ہے لیکن میں نے کوئی علیحدہ خانہ "اسلام" کے نام سے نہیں بنایا ہے۔ اس امر کو سمجھنا دشوار نہیں ہے۔ اسلام کوئی ایسا مذہب نہیں ہے جو زندگی سے الگ تھلگ ہو۔ یہ اپنے ہمہ جہت شعبوں کے ساتھ خود ایک زندگی اور سرچشمہ حیات ہے۔ مذہبی زندگی اور غیر مذہبی زندگی کے مابین کوئی خط فاصل نہیں ہے۔ زندگی کے سارے دھارے کو اسلامی اصولوں کے مطابق بنایا ہے۔ دفاع ہمارے مذہب کا ایک جزو ہے۔ افلاس کا خاتمہ اور معاشی خوش حالی ہمارے ایمان کا حصّہ ہے۔ تعلیم ہمارے دین کے فروغ کا ایک ذریعہ ہے۔ اخلاقی تربیت "بدعنوانیوں" کے خلاف سب سے بڑی ضمانت ہے۔ اسلام ان تمام شعبوں میں داخل ہوتا اور ان میں انقلابی تبدیلیاں پیدا کرتا ہے۔ اس مقصد کے لیے کسی علیحدہ ندی کی ضرورت نہیں یہ خود مرکزی دھارے کی حیثیت رکھتا ہے۔ بہر حال تمام تر بحث کو اس کے صحیح خدوخال کے ساتھ پیش کرنے کے لیے میں نے یہ ضروری سمجھا کہ اسلام کی روشنی میں قومی زندگی کے تمام مقاصد کا مختصراً تذکرہ کردوں۔ چنانچہ میں نے سود معاف معیشت کی تشکیل کے مسئلے پر ایک علیحدہ باب کا اضافہ کیا ہے۔ پاکستان کے طویل المعیاد ترقی کے نقطۂ نظر سے سود کو ختم کرنا انتہائی اہم مسئلہ ہے اور میں نے اس پر علیحدہ بحث کرنے کی کوشش کی ہے۔ اپنی اہمیت کے اعتبار سے آگے چل کر یہ ہمارے مجموعی قومی مسئلے کے تقریباً نصف

حصّے پر حاوی ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے سرسری طور پہ ہی سہی، یہاں چھیڑا گیا ہے۔

آخر میں اپنے قارئین کو دعوت دوں گا کہ وہ میرے نظریات کے بارے میں اپنی منصفانہ اور آزادانہ رائے دیں کیونکہ اس سے مجھے اپنے خیالات کو ترقی دینے اور اسی انداز سے سوچنے والے افراد سے رابطہ قائم کرنے میں بہت مدد ملے گی۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ ان صفحات میں جو کچھ صحیح اور قابل قدر ہے اسے لوگوں کے دلوں میں اتار دے اور جو کچھ نہیں ہے اس کے لیے مجھے معاف فرمائے اور لوگوں کو اس سے محفوظ فرمائے۔

جنیوا (ابراہیم احمد باوانی)

باب دوم

ہمارے قومی مقاصد

میں جس مرکزی تصور پر زور دینا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ پاکستان کے قومی مسائل کو ایک نئے زاویے سے دیکھنا چاہیئے اور ہماری قومی زندگی کے تمام شعبوں میں بنیادی تبدیلیاں پیدا کرنا چاہیے۔ آئندہ صفحات میں میں نے ان بعض انقلابی تبدیلیوں کا ذکر کیا ہے جن کی ہمیں اپنی پالیسی اور پروگرام میں ضرورت ہے۔ لیکن اس سے قبل میں ان حقیقی مقاصد کو مختصراً بیان کرنے کی اجازت چاہوں گا جن کے حصول کے لیے ہمیں جدوجہد کرنی چاہیے۔

قومی ترقی کے ضمن میں کسی بھی متفقہ اور مشترکہ جدوجہد کا پہلا لازمی اصول یہ ہے کہ قومی مقاصد کا واضح اعلان ہو نیز ان مقاصد کی درجہ بندی کی جائے جن کی تکمیل کے لیے تمام پالیسیوں، پروگراموں اور منصوبوں پر عمل درآمد کرنا ہے۔ اسلام کی محض زبانی خدمت کی وجہ سے ہماری حکومت ان مقاصد کی ترتیب و تدوین میں ناکام رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم متضاد مقاصد کے لیے کام کر رہے ہیں اور چاروں طرف بھاگ دوڑ کر رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم کچھ بھی حاصل نہ کر سکے۔ یہاں تک کہ خصوصیت کے ساتھ گزشتہ دس سال کے دوران وہ نام نہاد معاشی ترقی بھی نہ کر سکے جس کو ہم نے اپنا خدا بنا رکھا تھا۔

لہٰذا یہ امر ضروری ہے کہ سب سے پہلے ان مقاصد کی ترتیب سے آغاز کیا جائے جنھیں ہم ایک قوم کی حیثیت سے حاصل کرنا چاہتے ہیں اور جو ہماری تمام پالیسیوں اور

پروگراموں کی کارکردگی کی کسوٹی کا کام بھی دیں۔ پاکستان میں معاشی منصوبہ بندی کے مسخ شدہ حالات اور اسلام، جمہوریت اور سماجی انصاف جیسے ریاکارانہ نعروں کی وجہ سے مختلف ذہنوں میں ابہام اور غلط فہمی کے جو بادل چھائے ہوئے ہیں ان کو دور کرنے کے لیے بھی یہ کام ضروری ہے۔ اس صورت حال کی روشنی میں مناسب یہ ہوگا کہ ہم اپنے حقیقی قومی نصب العین اور اس سے برآمد ہونے والے مقاصد کو واضح اور صحیح الفاظ میں بیان کر دیں۔

ہمارا حقیقی مطمح نظر ہر جہت میں قومی ترقی کے کام کو فروغ دینا ہے۔
تاکہ ملت اسلامیہ پاکستان دنیا میں اپنا جائز مقام حاصل کر سکے نیز
اسے تمام دنیا کے لیے صداقت کا گواہ بھی بنانا ہے جیسا کہ قرآن حکیم
میں ارشاد ہوا ہے۔ ؎

ایسی صورت میں ہم اپنے پیش نظر کوئی تنگ یا محدود مقصد نہیں رکھ سکتے۔ معاشی ترقی اس پورے مقصد کا محض ایک جزو ہے۔ اگرچہ یہ لازمی اور ناگزیر جزو ہے۔ لیکن ہے محض ایک جزو ہی۔ ہمارے مقصد میں اخلاقی، عقلی، تعلیمی، معاشی، سماجی، سیاسی اور بین الاقوامی ترقی شامل ہے اور اس ترقی کے ہر پہلو کو ہمارے قومی نصب العین سے متعلق ہونا چاہیے۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ پاکستان کی ترقی کا مطلب حسب ذیل ہے۔

(۱) ایک اسلامی معاشرہ کا قیام جس میں قرآن اور سنت کی تعلیمات کا عملی طور

؎ اور اسی طرح ہم نے تمہیں بیچ کی امت بنایا تاکہ تم (صداقت الٰہی یعنی دین اسلام کے) گواہ رہو نوعِ انسانی کے سامنے اور ہمارا پیغمبر تم پر (اس کا) گواہ ہے۔

(القرآن: ۲: ۱۴۳)

پر نفاذ ہو اور ان تمام راہوں کو بند کر دیا جائے جو عوام الناس کو گمراہی کی طرف لے جاتے ہیں

"حکم اللہ کے لیے ہے۔ اس نے تمہیں حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی اطاعت نہ کرو۔ یہی سچا راستہ ہے۔"

(القرآن: پارہ ۱۲: ۴۰)

(ب) ملک کے تمام علاقوں اور تمام حصوں کے افرادی اور مادی وسائل کو ترقی دے کر حقیقی معاشی استحکام اور خوشحالی کا حصول۔

"اور کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین پر تمہارے لیے عام کر دی ہیں اور اپنی ظاہرا اور پوشیدہ نعمتیں تم پر مکمل کر دی ہیں۔"

(القرآن)

"نماز کے فرض کی ادائیگی کے بعد دوسرا فرض حلال کا رزق حاصل کرنے کے لیے محنت کرنا ہے۔

(حدیث :۔ رسول اکرمؐ)

"متعدد فقہا نے کہا کہ دستکاری، پیشوں اور صنعتوں کو ترقی دینا فرض کفایہ ہے اور یہ اس لیے ضروری ہے کہ ان کے بغیر معاشی زندگی کی تکمیل ممکن نہیں ہے۔ یہ (فرض) جہاد کے ہم مرتبہ ہے جو خود ایک فرض کفایہ ہے۔

(امام ابن تیمیہ :۔ الحسبۃ فی الاسلام)

اس کا مطلب یہ ہے کہ معاشی ترقی ہمارا ایک اہم مقصد ہے لیکن ایک ایسی معاشی ترقی جو ہمارے قومی استحکام کو فروغ دے اور ہمارے عوام کی ہمہ جہتی خوشحالی کی ضمانت دے۔ محض "صنعتی ترقی" ہمیں مطلوب نہیں ہے۔ اسی لیے ہم نے اسے

"حقیقی معاشی استحکام اور خوشحالی کی تشکیل و تعمیر" کا نام دیا ہے۔

(ج) ایک حقیقی فلاحی مملکت کی تشکیل، جہاں افلاس اور استحصال کے وجود کو ختم کر دیا گیا ہو۔ جہاں انسان کو معاشی اور سماجی عمل کا مرکز بنا کر اس کو اخلاقی اور مادی خوشحالی کا محور بنایا جائے جو اس سارے لائحہ عمل کا مقصد اولیٰ ہے۔ ایک ایسی مملکت جہاں تمام انسانی اُمور انصاف اور اُخوت کے اصولوں کے مطابق طے کیے جائیں۔

"بے شک ہم نے واضح نشانیوں کے ساتھ اپنے پیغمبر بھیجے ہیں
اور ان پر کتاب اور میزان (یعنی انصاف قائم کرنے کا اختیار)
نازل کیا ہے تاکہ انسان صحیح راہ کا مشاہدہ کر سکیں"

(القرآن)

"مسلمان وہ ہیں کہ اگر ہم انھیں زمین پر حکومت عطا کریں تو وہ صلوٰۃ
اور زکوٰۃ (کا نظام) قائم کرتے ہیں۔ وہ نیک کام کی تلقین کرتے
اور بدی سے باز رکھتے ہیں۔"

(القرآن)

"جس کا کوئی مددگار نہ ہو حکومت اس کی مددگار ہوتی ہے۔"

"حدیث نبویؐ"

"جو کوئی ذمہ داریاں چھوڑ کر مرے (یعنی اپنی وفات کے وقت قرضہ
یا بے یار و مددگار لواحقین چھوڑے) تو اس قسم کی تمام ذمہ داریوں
کا بوجھ ہم پر (یعنی حکومت پر) عائد ہوتا ہے۔

(حدیث نبویؐ)

"خدا کی قسم اگر ہم ان لوگوں کو، جن کے زمانہ شباب کی خدمات

سے ہم نے پورا پورا فائدہ اُٹھایا ہے، ان کے بڑھاپے میں بے یار و مددگار چھوڑ دیں تو ہم انصاف کرنے میں ناکام ہیں۔"

خلیفہ عمر فاروق رض

"اللہ نے زکوٰۃ مسلمانوں پر فرض کی ہے۔ اسے ان میں کے امیروں سے جمع کر کے ان میں کے ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیا جائے"

(حدیث نبویؐ)

"ان کی دولت میں فقراء اور مساکین کا بھی حصہ ہے۔"

(القرآن)

"اگر کوئی آبادی ایسی ہے جہاں کوئی شخص صبح کو اس طرح سو کر اُٹھے کہ اس نے رات بھر فاقہ کی حالت میں بسر کی ہو تو خدا اس طرح کی آبادی کی حفاظت سے ذمہ داری اُٹھا لیتا ہے۔"

(حدیث نبویؐ)

"بے شک تمام مسلمان ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔"

(القرآن)

"خدا نے تم کو انصاف اور رحم کرنے کا حکم دیا ہے۔"

(القرآن)

(د) ایک تعلیمی انقلاب لایا جائے تاکہ ہر شہری اپنے حصے کی تعلیم و تربیت حاصل کر سکے اور معیشت، معاشرت اور ثقافت کے استحکام اور ترقی میں اپنے منصب کی ادائیگی کے لیے تیار ہو سکے۔

"مجھے ایک معلّم کی حیثیت سے بھیجا گیا ہے۔"

(حدیث نبویؐ)

"علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔"

(حدیث نبویؐ)

"علم حاصل کرو کیونکہ جو اللہ کی راہ میں علم حاصل کرتا ہے وہ نیک کام کرتا ہے۔ جو اس کا تذکرہ کرتا ہے وہ خدا کی توصیف کرتا ہے۔ جو اس کی جستجو کرتا ہے وہ رضائے الٰہی حاصل کرتا ہے اور وہ جو اس کو عام کرتا ہے وہ خیرات کے برابر ثواب پاتا ہے اور جو دوسروں تک اسے پہنچاتا ہے وہ اللہ سے محبت کا ثبوت دیتا ہے۔"

(حدیث نبویؐ)

(ذ) ایک حقیقی نظام جمہوریت کا قیام، جس میں معاشرے کے تمام افراد کے لیے آزادی اور صحت مند ترقی کے مواقع کی ضمانت دی گئی ہو نیز انھیں صلاح مشورہ اور باہمی رضامندی سے اپنے امور طے کرنے کا حق حاصل ہو۔

"وہ اپنے معاملات باہمی صلاح مشورے سے طے کرتے ہیں۔"

(القرآن)

"بے شک تمہاری جان، تمہارا مال، تمہاری عزت، اتنے ہی مقدس ہیں جتنا آج کا یوم الحج۔"

"حدیث نبویؐ"

(ر) پاکستان کے دفاع کو مضبوط بنانا اور عوام الناس میں جہاد کا حقیقی جذبہ پیدا کرنا۔

"جس قدر تم سے ہو سکے انھیں (مسلح) طاقت اور گھوڑوں سے لیس کر دو تاکہ تم ان سے اللہ کے دشمنوں، اپنے دشمنوں اور دوسروں کو جو ان کے ساتھ ہیں اور تم انھیں نہیں جانتے نیست و نابود کر سکو۔"

القرآن

"ایک طاقتور مومن کمزور سے بہتر ہے۔"

(حدیث نبویؐ)

(ذ) عالم اسلام کے اتحاد کے لیے جدوجہد کرنا اور اسے مستقبل میں نوعِ انسانی کی بقا کے ضمن میں ایک تخلیقی اور تعمیری کردار ادا کرنے کے لیے فعال بنایا۔

"تم انسانوں میں سب سے اچھی قوم بنا کر اتارے گئے ہو تم حق پہ ایمان لائے ہو۔"

(القرآن)

"مسلمان ایک جسم کے مانند ہیں۔ اگر ایک عضو کو تکلیف ہوتی ہے۔ تو دوسرے اعضا بھی درد محسوس کرتے ہیں۔"

"حدیث نبوی"

یہ ہے ان مقاصد کا مختصر بیان جو بحیثیت ایک قوم ہمارے پیش نظر ہونے چاہئیں اور جن کے حصول کے لیے ہمیں جدوجہد کرنی چاہیے۔ صرف اسی طریقے سے ہم پاکستان کو "قائم" رکھ سکتے ہیں۔ میں یہاں ان الفاظ کا درج کرنا مناسب سمجھتا ہوں جو قائد اعظم نے کافی عرصہ قبل بصیرت افروز طریقے سے ادا کیے تھے۔

"ہماری منزل اور ہمارا مقصد اسلام ہے۔ ہم ایک ہیں اور ہمیں ایک قوم کی حیثیت سے آگے بڑھنا چاہیے۔ صرف اسی طرح ہم پاکستان کو برقرار رکھ سکتے ہیں۔" نیز یہ کہ

"پاکستان کا مطلب محض آزادی اور خود مختاری نہیں ہے بلکہ اسلامی نظریہ ہے جس کا تحفظ کرنا ضروری ہے۔ یہ ہمیں ایک قیمتی تحفے اور خزانے کی طرح ملا ہے اور ہمیں امید ہے کہ دوسرے بھی اس میں ہمارے حصہ دار ہوں گے۔"

باب سوم

زرعی انقلاب

پاکستان کے معاشی قلب ماہیت کے لیے وضع کی جانے والی کسی بھی تخلیقی اور حقیقت پسندانہ اسکیم کا زراعت سے آغاز ہونا چاہیے جو کہ ہماری ترقی کی کلید ہے۔ ہمارے مجموعی قومی پیداوار کا پچاس فی صد زراعت پر مبنی ہے ؎ تقریباً ۸۵ فی صد آبادی دیہی علاقوں میں رہتی ہے اور اس میں سے بیشتر افراد بالواسطہ یا بلاواسطہ اپنی روزی کے لیے زراعت پر انحصار کرتے ہیں۔ پیداوار، کھیت، برآمدات اور روزگار میں اس کے تناسب کی وجہ سے معیشت کی ترقی اور عوام کی خوشحالی کے لیے (زراعت) کی ترقی ناگزیر بن جاتی ہے۔ تمام بلند بانگ دعووں کے باوجود زراعت کے لیے جو وسائل مہیا کیے جاتے ہیں وہ معیشت کے اس اہم ترین شعبے سے ہماری مکمل بے توجہی کی غمازی کرتے ہیں پہلے منصوبے کا ۳۱ فی صد اور تیسرے منصوبے کا ۱۵،۴ فی صد زراعت کے لیے وقف کیا گیا ہے جبکہ نام نہاد صنعتی شعبے کے لیے جس میں صنعت ایندھن، معدنیات، پانی، بجلی اور ٹرانسپورٹ اور مواصلات شامل ہیں، تینوں

؎ زیادہ صحیح الفاظ میں یہ تناسب ۵۰ - ۱۹۴۹ء میں ۶۰ فی صد اور ۶۴ - ۱۹۶۳ء میں ۴۸،۶ فی صد تھا (ملاحظہ کیجیے "پاکستان کی معاشی پالیسی اور صنعتی ترقی کا جائزہ" از اسٹیفن آر لیوس صفحہ ۴) مرکزی دفتر شماریات کے مطابق ۶۷ - ۱۹۶۶ء میں مجموعی قومی پیداوار میں زراعت کا تناسب ۴۵،۷ فی صد تھا "پاکستان کے ۲۰ سال شماریات کی روشنی میں" صفحہ ۱۲)

منصوبوں میں بالترتیب ۶۵ فی صد، ۴۲ فی صد اور ۴۴.۴ فی صد مخصوص کیا گیا تھا۔ زراعت سے اس بے توجہی اور ترجیحات کو مسخ کر دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستان جسے ایشیا کا غذائی گودام سمجھا جاتا تھا جو تقسیم ہند کے وقت فاضل غذا کا حامل تھا غذائی اجناس درآمد کرنے کے لیے انتہائی مشکل سے حاصل کیے ہوئے زرمبادلہ کو پاونڈ اور ڈالر کی شکل میں خرچ کر رہا ہے۔ عام کسان کی حالت ابتر ہو گئی ہے اور افراطِ زر نے اس کی گردن توڑ دی ہے۔ جزوی قحط ایک مستقل پہلو بن گیا ہے۔ زرعی قرضوں میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور تمام شواہد سے ثابت ہوتا ہے کہ بدقسمتی سے اہل زراعت کی حالت دس یا بیس سال پہلے کے مقابلے میں آج بدتر ہے۔

آزادی کے فوراً بعد ہمیں پوری شدت کے ساتھ ایک ''زرعی انقلاب'' کا منصوبہ بنانا چاہیے تھا نہ کہ ''صنعتی انقلاب کا'' جیسا کہ ہم نے کیا ہے۔ درجنوں زرعی کالجوں، کیمیاوی کھاد کے متعدد کارخانوں، ٹریکٹروں اور جدید کاشتکاری کے دیگر سازو سامان بنانے والے کارخانوں زرعی قرضہ اور منڈیوں کے اداروں کی ہمیں ضرورت تھی تاکہ نئے طریقے ہماری زرعی پیداوار میں انقلابی تبدیلی کر دیتے ''کارخانہ کی پیداوار کے بجائے جس نے ہمیں بڑی صنعتوں کے قیام کے لیے لاکھوں پونڈ اور ڈالر قرض لینے پر مجبور کیا اگر ہم زراعت کے ذریعے اپنی معیشت کی تعمیر کرتے تو اس میں ہمیں ان نئے طریقوں سے مدد ملتی۔ چنانچہ اب اس کا فطری نتیجہ ہمارے سامنے یہ ہے کہ ہم قرضوں میں ڈوبے جا رہے ہیں نیز ایک طرف ہماری معیشت متزلزل اور غیر مستحکم ہے تو دوسری طرف غذا کی قلت کی وجہ سے ہم بھیک کے پیالے ہر جگہ لے کر جاتے ہیں اور اپنے بارہ کروڑ عوام کے لیے خوراک حاصل کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم سنگین صنعتی مسائل سے دوچار ہیں جو ہمارے انتہائی گنجان اور مرکزی حیثیت والے صنعتی علاقوں کی پیداوار ہیں۔ ہمارے صنعتی مزدوروں میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جو اپنے فطری مولدوں سے تعلق منقطع کر کے آئے ہیں اور گھروں کے

بغیر، گھر والوں کے بغیر، سماجی ہم آہنگی کے بغیر ناگفتہ بہ حالات میں زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں اور مختلف قسم کے استحصال پسندوں کا آسانی سے شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ خطرناک صورت حال شر پسندوں کو ہر جگہ انتشار اور بے اطمینانی پیدا کرنے کے بے انتہا مواقع فراہم کرتی ہے۔

زراعت جو ایک عطیۂ خداوندی ہے، ہمیں اب عزیز نہیں رہی ہے اور پچھلے متعدد برسوں کے دوران اس کا گلا گھونٹنے کے لیے ہم جو کچھ کر سکتے تھے وہ ہم نے کیا۔ ایک انتہائی بدقسمت اور غیر حقیقت پسندانہ صنعتی پالیسی وضع کی گئی اور یہ سمجھ لیا گیا کہ چند صنعتوں کی ترقی سے ہمارے تمام مسائل حل ہو جائیں گے۔ یہ ایک انتہائی نقصان دہ مطالعۂ تاریخ اور ترقی کے عمل کے بارے میں نہایت گمراہ کن غلط فہمی تھی۔ زندگی اور معیشت کے ان بنیادی حقائق پر نظر ڈالنے کے لیے کسی شخص کا پیشہ ور ماہر معاشیات ہونا ضروری نہیں ہے۔ کم از کم چھ ایسے اسباب ہیں جو عام سوجھ بوجھ سے سمجھ میں آجاتے ہیں اور وہ معاشیاتی نقطۂ نظر سے بھی معتبر ہیں اور وہ ہمیں زراعت کی اس ناگزیر اور عملی اہمیت کا احساس بھی دلاتے ہیں جو پاکستان جیسے ترقی پذیر ممالک کی معاشی ترقی کو فروغ دینے کے لیے ضروری ہیں۔

(۱) چونکہ زراعت مجموعی قومی پیداوار کا تقریباً ۵۰ فی صد ہے اس لیے زرعی پیداوار میں اضافے کا مطلب خود مجموعی قومی پیداوار میں اضافہ ہے۔ غذائی رسد میں اضافے سے معاشی ترقی کی رفتار میں متعدد طریقے سے اضافہ ہوتا ہے۔ دیہی آبادی کی آمدنیوں میں اضافے سے نہ صرف انھیں خوشحالی حاصل ہوتی ہے بلکہ ان کی موثر طلب اور ان کی بچت میں بھی اضافے ہوتے ہیں۔ غذائی پیداوار میں اضافے سے قیمتوں پر بھی اثر پڑتا ہے اور اس طرح غیر زرعی شعبے میں بھی معاشی ترقی کی رفتار تیز ہوتی ہے۔ چنانچہ زرعی ترقی سے ہمہ گیر معاشی ترقی ہوتی ہے۔

(۲) زراعت سے خام اشیاء حاصل ہوتی ہیں جنھیں صنعتوں میں استعمال

کیا جاتا ہے۔ تجارت بھی زرعی پیداوار کی محتاج ہے کیونکہ اسے خام اشیاء، تیار شدہ اور نیم تیار شدہ اشیاء کی صورت میں برآمد کیا جاتا ہے۔ ان تمام سرگرمیوں سے روزگار کی گنجائشیں پیدا ہونا بھی ایک اہم امر ہے۔ نسبتاً زیادہ زرعی پیداوار کا مطلب بین الاقوامی زرعی مبادلہ میں اضافہ بھی ہوتا ہے اولاً اس زرمبادلہ کی بچت جسے غذائی درآمدات پر خرچ کیا جارہا ہے اور ثانیاً برآمدی آمدنیوں کو فروغ دیا جاسکتا ہے۔

(۳) زراعت میں ترقی کی وجہ سے ایک بہت بنیادی لیکن خاموش انقلاب جنم لیتا ہوتا ہے جسے ہم معیشت کی تدریجی ترقی کہہ سکتے ہیں۔ زرعی ترقی خورد و نوش کی معیشت کو منڈیوں کی معیشت میں بتدریج تبدیل کر دیتی ہے اور اس سے ہمہ گیر معاشی ترقی کا کام آسان اور پائیدار ہو جاتا ہے۔

(۴) زرعی شعبے اور دوسرے شعبوں میں تشکیل سرمایہ میں بھی اضافہ ہوتا ہے اور زراعت اور دوسرے شعبوں میں مزید ترقی کے لیے مزید وسائل مہیا کیے جاسکتے ہیں۔

(۵) زرعی ترقی اور پیداوار اور استعداد کار میں اضافے کی وجہ سے افرادی طاقت کو زراعت اور شہری صنعتوں میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔ ؎

؎ نسبتاً سنجیدہ قاری حسب ذیل کتب سے رجوع فرمائیں۔

ایگریکلچر ان اکنامک ڈیولپمنٹ مرتبہ کار ایچر اور لارنس وٹ، میک گراہل ہل ۱۹۶۴ء۔ دی اکنامکس آف ایگریکلچر از ڈیوڈ مٹکاف۔ پنگوئن۔ ڈیوڈ مٹکاف لکھتے ہیں:- "زرعی پیداوار میں تیز رفتار اضافہ اہم ہے کیونکہ اس کے نتیجے میں غذائی اشیاء نسبتاً کم قیمتوں پر دستیاب ہوتی ہیں لہٰذا غیر زرعی شعبے میں غذائی اشیاء کی خریداری کے لیے آمدنی کا کم حصہ خرچ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ غیر زرعی شعبے کی پیداوار میں اضافے کی موثر مانگ پیدا ہوتی ہے۔ اس کی وجہ سے غیر زرعی شعبے کی ترقی یافتہ پیداوار کی منفعت میں اضافہ ہو جاتا ہے اور

(۶) زرعی ارتقا سے مزید معاشی ترقی کے لیے مضبوط بنیاد تعمیر ہوتی ہے۔ درحقیقت ایک زرعی بنیاد رکھے بغیر زرعی انقلاب لانے کی کوشش بے سود ہے۔ آخری تجزیے میں زراعت اور صنعت میں کوئی تضاد نہیں ہے دونوں دراصل ایک دوسرے کا تکملہ ہیں لیکن صنعتی ترقی کی ظاہرا چمک دمک کی وجہ سے اس حقیقت کو اکثر فراموش کر دیا جاتا ہے صنعت کو ترقی کرنا چاہیے لیکن زرعی بنیاد کی ترقی کے بعد اور اس کی صورت یوں ہے کہ دونوں ایک دوسرے کی مدد کریں اور ایک دوسرے کو برقرار رکھیں اور آپس میں متصادم نہ ہوں ایک ممتاز مغربی ماہر معاشیات اور اقتصادی مورخ سائمن کزنیٹس پر زور الفاظ میں کہتا ہے کہ "اقتصادی مورخین اس امر پر متفق الرائے ہیں کہ کسی بڑے ملک میں کامیاب ترقی کی کوئی ایسی مثال نہیں ملتی جس میں زرعی پیداوار میں اضافے کو صنعتی ترقی سے مقدم یا اس کے قدم بقدم نہ رکھا گیا ہو" یہ ہے معاشی اور قومی ترقی میں زراعت کی اہمیت۔ تمام دنیا کے ماہرین معاشیات و ماہرین منصوبہ بندی اسے تسلیم کر رہے ہیں۔ ممتاز برطانوی ماہر معاشیات آرتھر لیوس نے پر زور الفاظ میں کہا ہے کہ "صنعتی اشیاء کے حجم کو بڑھاتے رہنا فائدہ مند

یہاں سرمایہ لگانے کے لیے سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ غیر زرعی شعبے کی توسیع سے اس شعبے میں شہری آبادی اور دیہی علاقوں کے مزدوروں کے لیے روزگار کے مواقع میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ مزید برآں نسبتاً گرتی ہوئی غذائی قیمتوں کا مطلب حقیقی آمدنی میں اضافہ ہوتا ہے اس طرح اجرتوں میں اضافے کے دباؤ میں تخفیف ہو جاتی ہے۔ اس سے غیر زرعی شعبے میں ہونے والی سرمایہ کاری کے منافع جات برقرار رہتے ہیں یا ان میں اضافہ ہوتا ہے۔ کم غذائی قیمتوں سے سیاسی بے اطمینانی میں بھی کمی واقع ہوتی ہے۔ ڈیوڈ مٹکاف "دی اکنامکس آف ایگریکلچر" پینگوئن ماڈرن اکنامکس ۱۹۶۹ء۔ صفحہ ۵۷

؎ سکس لیکچرز ان اکنامک گروتھ صفحات ۵۹-۶۰ (معاشی ترقی سے متعلق چھ تقاریر)

نہیں ہے جب تک کہ اس کے ساتھ ساتھ زرعی پیداوار میں اضافہ نہ ہو رہا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ صنعتی اور زرعی انقلابات ہمیشہ ایک دوسرے کے قدم بقدم رہتے ہیں اور جن ملکوں میں زراعت جامد رہتی ہے وہاں کوئی صنعتی ترقی نظر نہیں آتی ہے۔"[1] حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی حقیقی معاشی ترقی کے لیے زرعی ترقی ناگزیر ہے۔ لیکن پاکستان کی منصوبہ بندی میں اس حقیقت کو نظر انداز کیا گیا اور کیا جا رہا ہے۔ اس سے معیشت کی غیر صحت مندی کا اظہار ہوتا ہے۔ اور اگر کسی قسم کی ترقی کرنا ہے تو اس کا علاج ضروری ہے۔ ایک اہم عصر ماہر معاشیات نے اس قسم کے منصوبہ گردں اور سیاست دانوں کی ذہنی کیفیات کا بہت صحیح نقشہ کھینچا ہے۔ وہ لکھتا ہے:۔

"بہت سے افراد کے ذہنوں میں صنعت کا مطلب ترقی اور زراعت کا مطلب جمود ہے۔ صنعت سائنس اور ٹیکنالوجی کا مجموعۂ کمالات ہے، جدید دنیا کی مادہ خلا پہ حکمرانی، مشینوں اور انسانوں پر فتح کی نقیب ہے جبکہ زراعت غیر مہذب زندگی کا مخزن ہے۔ صنعتی طور طریقے انفرادی دولت اور قومی طاقت کی طرف لے جاتے ہیں جبکہ زرعی طور طریقے انفرادی افلاس اور قومی محکومی کی دلیل ہیں۔۔۔۔ اس قسم کے خاکے بہت آسانی سے پیش کیے جاتے ہیں اور اس کے بعض مبالغہ آمیز پہلو عوام کے ذہن پر چھا جاتے ہیں۔ ترقی پذیر علاقوں میں صنعت کے حق اور زراعت کے خلاف جو تعصبات پائے جاتے ہیں ان کا اظہار متعدد طریقوں سے ہوتا ہے جن سے معاشی ترقی کو خطرہ لاحق ہوتا ہے یا کم از کم ترقی کی رفتار کم ہو جاتی ہے۔"[2]

---

[1] ڈبلیو۔ اے۔ لیوس "اکنامک ڈیولپمنٹ وِتھ اَن لمیٹڈ سپلائز آف لیبر" مانچسٹر اسکول آف اکنامکس اینڈ سوشل اسٹڈیز جلد ۲۲۔ نمبر ۲، ۱۹۵۴ء

[2] "ایگریرین ریولوشن اینڈ اکنامک پروگریس: اے پرائمر آف ڈیولپمنٹ" از ریز ٹیکیل پریجر اسپیشل اسٹڈیز ان انٹرنیشنل اکنامکس اینڈ ڈیولپمنٹ ۱۹۶۸ء

یہی مصنف زراعت کے ضمن میں پالیسی کو تبدیل کرنے پر زور دیتا ہے اور ترقی پذیر ممالک سے ہمہ گیر ترقیاتی لائحہ عمل میں بنیادی تبدیلی کا شدت سے مطالبہ کرتا ہے یہ حقیقت ہے کہ زراعت پاکستان کی ترقی میں کلید کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن ہم نے اس کلید کو کبھی استعمال نہیں کیا ہے بلکہ صرف بند دروازوں سے اپنا سر پھوڑنے کی کوشش کرتے رہے اگرچہ ہمیں وقتاً فوقتاً خبردار کیا جاتا رہا۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ پاکستان میں غیر ملکی مشیروں کا کردار مجموعی طور پر مشتبہ رہا ہے لیکن ایک یا دو بار دانشمندانہ آوازیں ضرور بلند ہوئیں اور ہم نے اپنی جہالت یا حماقت کی وجہ سے ہمیشہ ان کی طرف سے اپنے کان بند رکھے اور صنعتی کارخانوں کی تعمیر کے پیچھے دوڑتے رہے۔ مسٹر جان اوبیل کی تقریر سے اقتباس پیش کرنا مناسب رہے گا جو زراعت سے بے توجہی کے سلسلے میں ایک انتباہ سے کم نہیں ہے۔ روٹری کلب لائلپور کے ممبروں کے سامنے ایک تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا " پاکستان کو درپیش کوئی مسئلہ بھی زیادہ اہم یا زیادہ بنیادی نہیں ہے۔ البتہ یہ ملک کی حکومت اور عوام کی زیادہ سے زیادہ توجہ کا مستحق ہے۔ بلاشبہ اسے اس قسم کی توجہ کی ضرورت ہے۔ ... سادہ حقائق یہ ہیں کہ آج کل پاکستان اپنی موجودہ آبادی کی کم سے کم ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے غذائی اجناس خواہ گندم ہو خواہ چاول کافی مقدار میں پیدا نہیں کر رہا ہے جیسا کہ میں نے کہا ہے، آبادی مستقل بڑھ رہی ہے۔ ہر گھنٹے ۱۲۵ افراد کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد سے آبادی میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ لیکن کیا اس زمانے میں اس کے ساتھ ہی ساتھ غذائی پیداوار میں بھی اضافہ ہوتا رہا؟ افسوس کہ اس کا جواب نفی میں ہے "

ہماری زرعی پیداوار کے بارے میں وہ کہتے ہیں " مجھے بتایا گیا ہے کہ مشرقی پاکستان میں چاول کی فی ایکڑ اوسط پیداوار کوئی دس من ہے۔ اس سال موسم گرما میں دولت پورہ کے دیہی امداد کے ادارے نے آزمائشی قطعات پر کاشتکاری کے جدید

طریقوں کی مدد سے چاول کی کاشت کی اور اوسط پیداوار چالیس من فی ایکڑ سے زائد حاصل ہوئی۔ یہ چار سو فی صد اضافہ ہے یا بالفاظ دیگر چاول کی مناسب پیداوار کا مسئلہ حل کرنے کے لیے جو اضافہ ضروری ہے اس سے یہ دس گنا زائد تھی۔ گندم کے سلسلے میں اس قسم کے تجرباتی نتائج کی مثالیں مغربی پاکستان سے بھی پیش کی جا سکتی ہیں۔" مسٹر ہیل نے وضاحت کرتے ہوئے مزید کہا کہ "اضافہ شدہ فصلوں سے جو آمدنی ہوئی وہ مذکورہ طریقوں پر صرف ہونے والی لاگت سے تین گنا زائد تھی اس لحاظ سے اضافہ شدہ غذائی پیداوار کا مطلب اضافہ شدہ آمدنی ہے۔ پاکستان میں گندم اور چاول کی حق ایکڑ اوسط پیداوار دنیا میں سب سے کم ہے۔"

مسٹر ہیل نے مزید کہا "میں یقین نہیں کر سکتا کہ پاکستان کا کاشتکار اپنی پیداوار کو بہتر بنانے سے دلچسپی نہیں رکھتا ہے۔ میں یقین نہیں کر سکتا کہ اگر اس کو ایسے طریقوں سے روشناس کرایا جائے جس سے اس کی آمدنی اور وسائل میں اضافہ ہو تو وہ ان کو بروئے کار لانے کا متمنی نہیں ہوگا۔ لہذا مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان خطوط پر غذائی پیداوار کو بڑھانے کے سلسلے میں سب سے پہلے جدوجہد کرنی چاہیے۔"

ہماری اور عظیم اور محب وطن حکومتوں نے ہماری زراعت کے لیے کیا کیا ہے؛ حالانکہ ہمارا ملک بنیادی طور پر زرعی ہے اور ہماری آبادی کا ۸۵ فی صد حصہ کھیتوں میں کام کرتا ہے۔ امریکہ میں جو بنیادی طور پر ایک صنعتی ملک ہے۔ آبادی کا صرف ۵ فی صد حصہ کھیتوں میں کام کرتا ہے جبکہ ہمارے ملک میں صورت حال بالکل برعکس ہے مسٹر ہیل کے بیان کے مطابق "ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں کوئی ۱۵ فی صد عوام زرعی پیداوار سے متعلق ہیں۔ تاہم وفاقی حکومت کا سب سے بڑا شہری محکمہ شعبۂ زراعت ہے۔ علاوہ ازیں میرے ملک کی تشکیل کرنے والی ۴۸ ریاستوں میں سے تقریباً ہر ایک صوبائی یا سرکاری زرعی محکمے خاصے فعال ادارے ہیں اس بات سے ہماری مہربان حکومتوں

کی آنکھیں نہیں کھلیں۔ البتہ حال ہی میں کچھ کام بڑے تامل کے بعد ناکافی طور پر ہوا ہے۔ اگر کوئی شخص اس ضمن میں ہونے والے کام کا حقیقی جائزہ لینا چاہے تو اسے ان جان لیوا اور نامناسب طریقوں کو دیکھ کر صدمہ پہنچے گا جو ہماری حکومت کے شعبۂ زراعت میں جاری ہیں۔ نچلی سطح پر پٹواریوں اور مختارکاروں سے لے کر انتہائی بالائی سطح تک کے لوگ غریب کسانوں کا استحصال کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے اور اپنی جیبیں گرم کرتے ہیں اور ہر ممکنہ بدعنوانی میں ملوث رہتے ہیں۔ یہ صورت حال خاصی تشویشناک ہے۔ مسٹر بیل نے کہا ہے کہ "پاکستان میں ۸۵ فی صد افراد زرعی پیداوار میں مصروف ہیں لیکن اس کے باوجود حکومت کا وہ شعبہ جو سب سے کم عزت اور سب سے کم حمایت کا حامل ہے، جس میں تنخواہ کا سب سے گرا ہوا معیار رکھا گیا ہے جسے حکومت اور عوام سب سے کم اہم سمجھتے ہیں، وہ زراعت کا شعبہ ہے۔" یہ بات بہت عجیب اور ناقابلِ یقین معلوم ہو سکتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ زراعت کا عہدہ ہمیشہ ایسے شخص کو دیا جاتا ہے جو اس کی ابجد سے بھی ناواقف ہوتا ہے۔ زراعت کے سلسلے میں اسی قسم کی المناک زیادتی عام طور پر ہوتی ہے۔ گزشتہ دنوں ایک وزیر نے کہا تھا کہ موجودہ غذائی قلت اس لیے ہے کہ مارشل لاء کے تحت مزدوروں کو زیادہ اجرتوں کی یقین دہانی کی گئی ہے چنانچہ انھوں نے زیادہ کھانا شروع کر دیا ہے۔ اس قسم کے افراد اگر اربابِ اقتدار ہوں تو بہتری کی کیا توقع کی جا سکتی ہے۔!

کیا ہمیں اس سے زیادہ حقیقی اور معقول دلائل کی ضرورت ہے؟ عمومی طور پر ہمارے عوام کو اور خصوصی طور پر حکومت کو یہ ثابت کرنے کے لیے اور کیا درکار ہے کہ ہم نے اس عطیۂ خداوندی کے سلسلے میں مجرمانہ خیانت کی ہے جس میں ہماری آبادی کا ۸۵ فی صد حصہ مشغول ہے؟ لیکن ہماری حکومتیں محض ملک کو دیوالیہ کر کے صنعتیں قائم کرنے کے درپے رہی ہیں۔ یہ صنعتیں ہماری آبادی کے محض ۵ سے ۷ فی صد حصے کو

روزگار مہیا کرتی ہیں مختلف حلقوں سے انتباہ کے باوجود غالباً دیدہ و دانستہ یہ سب کچھ کیا گیا۔ شاید اس لیے کہ "صنعت حکومتوں کے وقار" کا مسئلہ تھا۔ صنعت سے لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کا کام بھی لیا گیا اور عوام کو حقیقی مسائل سے بے خبر رکھا گیا۔ کیونکہ ان حقیقی مسائل کی پرواکس کو تھی۔ لیکن حقیقی مسائل سے کب تک گریز یا چشم پوشی کی جا سکتی ہے؟ اگر حکومت دیانت دار تھی اور ریاکار نہ تھی تو اسے اس امر کی ضرورت تھی کہ ہماری زراعت میں انقلاب برپا کرنے کے لیے ایک منصوبہ تیار کیا جاتا۔ اس کے بعد ہم اتنی غذا پیدا کر لیتے جو ہمارے فاقہ کش عوام کی ضرورتوں کو پورا کرتی اور جس کے فاضل حصے کو ہم زرمبادلہ کمانے کے لیے برآمد کر سکتے نیز ہماری بڑھتی ہوئی آبادی کو روزگار میسر آتا۔ لیکن اپنے ذہن کو کام میں لانے کے بجائے ہماری نام نہاد "عوامی حکومتوں" اور خود ساختہ "نجات دہندوں" نے "عظیم صنعتی انقلاب" کے منصوبوں کی خاکہ کشی جاری رکھی اور اپنی حماقتوں کے سر پر تاج رکھ کر "عشرہ اصلاحات" مناتے رہے۔ یہ تقریبات اور جشن عوام کے لیے تازیانے سے کم نہ تھے چنانچہ اس نے جلتی آگ پر تیل کا کام کیا۔ مورخین اس نہاد شاندار عہد کو "پاکستان کی تاریخ کے سب سے تاریک اور المناک ترین دور" کے نام سے یاد کرینگے۔

بیس سال کی آزادی اور پندرہ سال کی معاشی منصوبہ بندی کے باوجود ہم کثیر زرمبادلہ ادا کر کے غذائی اجناس درآمد کرتے رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے خدا کے عطا کردہ "قدرتی کارخانوں" سے بے اعتنائی برتی جو ہمارے لیے ہماری ضرورت سے زیادہ غذا پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اگر ہم اس مقصد کے حصول پر اپنی جدوجہد کو مرکوز کرتے تو مہنگائی کم ہوتی اور ہماری آبادی کے ۸۵ فی صد حصے کو زیادہ دولت میسر آتی، ملک کو معاشی استحکام حاصل ہوتا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہم بیرونی امداد کے تمام "بندھنوں" سے آزاد ہو جاتے جو ہمارے آزاد وجود کے لیے خطرہ بنے ہوئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس پر عمل پیرا ہو کر ہم اب تک حقیقی معنوں میں خوشحال

ہو چکے ہوتے اور بجا طور پر اپنی کامیابیوں کا جشن منا سکتے تھے۔

جاپان ایک چھوٹا سا ملک ہے لیکن وہ ایک عالمی طاقت بن کر اُبھر رہا ہے اس کی معاشی ترقی کی شرح دنیا میں اعلیٰ سطح کی حامل ہے اور اس کی کرنسی جرمن مارک اور امریکی ڈالر کی طرح مستحکم ہے۔ اس استحکام کا راز کیا ہے؟ جاپان کے تجربے سے واقفیت رکھنے والے کسی جھجک کے بغیر کہیں گے کہ جاپان کی طاقت اس امر کی مرہونِ منت ہے، کہ اس نے زراعت کو منفرد اہمیت دی ہے۔ اس کی معاشی ترقی کی جڑیں زرعی ترقی میں پیوست ہیں اور یہ دونوں قدم بقدم آگے بڑھ رہے ہیں۔ آج بھی زرعی شعبہ اس کی آبادی کے پچاس فی صد حصے کو روزگار مہیا کرتا ہے۔ اس صنعت زراعت سے الگ نہیں کی جا سکتی اور دونوں ایک دوسرے کی اعانت کرتے ہیں۔ جاپان کی صنعتی ترقی نے زراعت کی بیخ کنی نہیں کی بلکہ اس کو تقویت عطا کی ہے۔ ۵

جاپان کی آبادی تقریباً پاکستان کی آبادی کے مساوی ہے۔ اس کا مجموعی ارضی رقبہ صرف مغربی پاکستان کے رقبے کے نصف سے بھی کم ہے اور اس رقبے کا بھی ۸۵ فی صد حصہ آتش فشاں پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے۔ اس قدر محدود ارضی وسائل کے باوجود اس کی زراعت اس قدر اچھی ہے کہ نہ صرف وہ اپنی آبادی کی غذائی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے بلکہ دیگر ممالک کو چاول برآمد بھی کرتا ہے۔ کیا یہ ستم ظریفی نہیں ہے کہ جاپان ہمارے موثر ارضی رقبے کے دسویں حصے سے بھی کم زمین رکھتے ہوئے دنیا کو چاول برآمد کر رہا ہے اور ہم جاپان سمیت دنیا کے تمام ممالک سے یہ درآمد کر رہے ہیں۔ اہلِ جاپان جب پاکستان

---

۵ ملاحظہ کیجیے "دی اکنامک ڈیولپمنٹ آف جاپان" از ولیم ڈبلیو۔ لاک ووڈ، ابواب اوّل و سوم۔ "اے شارٹ ہسٹری آف ماڈرن جاپان" از ایلن، اور اکنامک گروتھ ان جاپان اینڈ دی یو۔ ایس۔ ایس۔ آر۔ از انگس میڈیسن حصہ اوّل۔

کا دورہ کرتے ہیں اور ہماری بے کار پڑی ہوئی زرعی زمینوں کو دیکھتے ہیں تو دنگ رہ جاتے ہیں۔ ایک جاپانی فنی ماہر نے مجھ سے ایک بار سوال کیا "آپ کے یہاں اتنی ساری زمین ہے۔ آپ کے عوام اور حکومت اس کی طرف توجہ کیوں نہیں دیتے؟ اگر آپ لوگ واقعی اپنی زمینوں کی طرف توجہ دینے لگیں تو آپ جاپان سے زیادہ خوشحال ہو سکتے ہیں آپ لوگ اپنے ہمہ گیر ارضی وسائل سے فائدہ کیوں نہیں اٹھاتے؟" میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔ میں نے اردو کی یہ کہاوت پڑھ کر موضوع گفتگو بدل دیا۔

"گھر کی مرغی دال برابر"۔ لیکن اس سے بھی صحیح تصویر سامنے نہیں آتی ہے۔ ہم درحقیقت دال تک کی پروا نہ کر کے مرغی کو فاقے کرا دیتے ہیں یا ایسی ہی حماقت ہے جیسے سونے کے انڈے دینے والی مرغی کا پیٹ چاک کر دینا۔

اگر کوئی قیادت زراعت سے مدد لے کر صحیح معنوں میں اپنے عوام کی بھلائی کے لیے کچھ کام کرنا چاہے تو جاپان کی مثال کو سامنے رکھا جا سکتا ہے۔ یورپ سے ہالینڈ اور ڈنمارک کی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ ان کی معیشت زراعت پر مبنی ہے اور ان کے عوام اعلیٰ معیار زندگی کے حامل ہیں۔ ہماری زمین میں کوئی نقص نہیں ہے۔ نقص دراصل زرعی پالیسیوں اور ان پر عمل درآمد کرانے کے ذمہ دار اداروں میں پوشیدہ ہے۔ اگر ہم اپنی پالیسیوں کو از سر نو مرتب کریں اور ان پر عمل درآمد کے لیے مناسب ادارے قائم کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم ایک معقول مدت میں ساری معیشت کی ہیئت تبدیل نہ کر دیں۔ ہماری زمین اپنے اجزائے نمو کے لحاظ سے بہت زرخیز ہے۔ ہمارے کاشتکار حوصلہ مند اور محنتی ہیں۔ اگر ہم صحیح طریق کار پر عمل کریں تو ہم یقیناً کامیاب ہو سکتے ہیں۔ ترقی یافتہ ٹیکنالوجی کے اس دور میں کوئی زمین بنجر نہیں ہے یہاں تک کہ ریگستان بھی نہیں۔ تو پھر پاکستان کی زرخیز دریائی زمین کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے۔ دنیا اب ریگستانوں کو گلستانوں میں بدلنے میں مصروف ہے جبکہ ہم اپنے ملک

ہیں یہ تکلیف دہ منظر دیکھنے پر مجبور ہیں کہ گلستان ریگستانوں میں تبدیل ہو رہے ہیں میرے عزیز دوست مسٹر رچرڈ سینٹ بارڈے بیکر جنھوں نے اپنی ساری زندگی زراعت کے لیے وقف کر دی ہے ۔ دنیا میں ریگستانوں کی وسعت کو روکنے کے خلاف جنگ کر رہے ہیں ۔ ریگستانی زمین کو قابلِ کاشت بنانے کے مسائل اور طریق کار پر وہ ہزاروں صفحات لکھ چکے ہیں ۔ ریگستانوں کو قابلِ کاشت بنانے کا ایک اہم ذریعہ چھڑکاؤ کے ذریعے کاشتکاری کا نیا فن ہے جسے ایسو آئل نے دریافت کیا ہے اور جو صحرائے اعظم کے اطراف کے افریقی ممالک میں بے پناہ کامیاب ثابت ہوا ہے ۔ جب ساری دنیا میں یہ سب کچھ ہو رہا ہے اور کامیابی حاصل کی جا رہی ہے تو ہم اپنی سرسبز زمینوں کو بنجر بننے کی اجازت دے رہے ہیں ۔ یہاں محض ایک مثال پیش کی جاتی ہے ۔ مسٹر بیکر میرے مہمان کی حیثیت سے پاکستان آئے اور حکام کو بحالی اراضی کی دانشمندانہ پالیسی کے فوائد سے آگاہ کیا لیکن کسی نے ان کی بات پر توجہ نہیں دی ۔ اگر ہم ہی اپنی زرخیز زمینوں کی طرف سے مجرمانہ غفلت برتتے رہے تو بنجر زمینوں کو بحال کرنے میں کون دلچسپی لے گا ۔ خواہ سیم و تھور کی وجہ سے یہ کتنی ہی وسعت کیوں نہ پا رہے ہوں !

دیر آید درست آید ۔ اگرچہ اب بہت دیر ہو چکی ہے تاہم اب بھی جاگنے کا وقت ہے اور زرعی پالیسی کی از سرِ نو تدوین اور اسے سب سے زیادہ مقدم سمجھنے کا موقع باقی ہے۔

اگر ہم اپنے اولین اور بنیادی قومی مسئلے کو خلوصِ نیت اور دیانت داری سے حل کرنا چاہتے ہیں تو دراصل "زیادہ غلہ اگاؤ" کی منصوبہ بندی جنگ کی منصوبہ بندی

ے جو حضرات اس منفرد تجربے سے دلچسپی رکھتے ہوں انھیں رچرڈ سینٹ بارڈے بیکر کی کتاب "ہمارا کانکوئسٹ (صحرائے اعظم کی فتح) لٹرورتھ پریس، لندن ۱۹۶۶ء" کا مطالعہ کرنا چاہیے ۔ اس کتاب کی بعض تصاویر زیرِ نظر کتاب میں بھی شائع کی گئی ہیں ۔ (یعنی انگریزی ایڈیشن میں)

کی طرح "قومی ہنگامی بنیاد" پر کرنی چاہیے اور اس ضمن میں بہتر فنی طریقوں، کیمیاوی کھاد کے زیادہ سے زیادہ استعمال، مزید زرعی کالجوں، ٹریکٹروں اور دیگر زرعی ساز و سامان کو چلانے اور ان کی دیکھ بھال کرنے کی تربیت کے مقامی مراکز پر توجہ دینی چاہیے خدا نے چاہا تو ہم اپنی زرعی پیداوار کو دو گنا نہیں بلکہ تین گنا کر سکتے ہیں۔ یہ ایک ایسا ہدف جسے حاصل کرنا "ناممکن نہیں ہے"۔ لہٰذا عوام کے نعرے یہ ہونے چاہئیں۔ "زراعت کا خاتمہ کر کے صنعت نہیں چاہیے"۔ اور "پہلے زراعت بعد میں صنعت" "سب سے پہلے زرعی انقلاب" "ہماری ثقافت کا تاج گانا نہیں زراعت ہے۔" "زراعت خدا کی عطا کردہ صنعت ہے۔" عوام کو چاہیے کہ وہ ہماری مستقبل کی حکومتوں کو یہ چیلنج قبول کرنے پر مجبور کریں۔ درحقیقت انھیں اس مسئلے کے سلسلے میں اتنی شدو مد سے آواز بلند کرنا چاہیے کہ سیاسی جماعتیں اس طرف توجہ دینے اور اسے اپنے منشوروں میں شامل کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ اگر وہ یہ نہ کریں تو انھیں برسراقتدار آنے کے لیے ووٹ ہی نہ دیا جائے۔ کیونکہ اس وقت وہ عوام کو مزید مایوسی اور فریب میں مبتلا کرنے کے لیے اپنے ہاتھوں میں چاند سورج لے کر آئیں گے۔ اگر ہم اپنی زراعت کی ازسرِ نو تشکیل کریں اور اس میں انقلاب برپا کر دیں تو نہ صرف ہمارے معیارِ زندگی میں ۴۰ فی صد کا حیرت انگیز اضافہ ہو جائے گا بلکہ ہم اپنے کم از کم بیس فی صد قومی مسائل کو بھی حل کر لیں گے۔

باب چہارم

صنعتوں کا قیام کب اور کہاں؟

صنعتوں کے قیام کو جس طرح ملک پر تھوپ دیا گیا ہے اس کے بارے میں میرے احساسات اب واضح ہو چکے ہوں گے۔ میرا خیال ہے کہ ہم اس میدان میں بہت بڑی غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں اور ہماری حکومتوں اور منصوبہ بند اداروں کو اس کی مکمل ذمّہ داری قبول کرنی چاہیے۔ "صنعتی پالیسی" سے متعلق تمام تر لائحہ عمل بنیادی اور اساسی طور پر غلط تھا۔ ہمیں اس میں انقلاب لانا اور اس کی نئی تشکیل کرنا چاہیے۔

ہر قسم کی صنعت قائم کرنے کے بجائے ہمیں پہلے ایسے کارخانے تعمیر کرنے چاہئیں تھے جو کیمیاوی کھاد اور ٹریکٹر سمیت کاشتکاروں کے ساز و سامان تیار کر سکتے ہیں اب ہم جو قدم اُٹھا رہے ہیں اس پر "بیس سال قبل" عمل کرنا چاہیے تھا۔

ہمیں ایک تدریجی صنعتی پالیسی وضع کرنی چاہیے تھی۔ زرعی صنعتوں کے قیام کی ہماری صنعتی ترقی کے منصوبے میں مقدم حیثیت ہونی چاہیے تھی۔ دوسرے مرحلے میں ہمیں صرف ایسی صنعتوں کا قیام کرنا تھا جو خود ہماری خام اشیاء کی بنیاد پر چل سکتی تھیں غیر صحت مند منصوبہ بندی کی وجہ سے بعض بڑے بڑے صنعتی یونٹ زیادہ تر درآمد شدہ خام اشیاء پر انحصار کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض یونٹ بے کار پڑے ہیں۔ کیونکہ زرمبادلہ کی قلت کی وجہ سے ان کے لیے خام اشیاء کا حصول ممکن نہیں۔ لیکن ہمارے صنعتی منصوبہ گروں نے

ان تمام مسائل کو نظر انداز کر دیا۔ نتیجتاً خدا کی عطا کردہ صنعت یعنی زراعت کی تباہی میں اس سے مدد ملی اور اس قسم کی صنعتیں قائم ہوئیں جنھیں ہرگز قائم نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ ہمارے صنعتی منصوبہ گر یہ عذرِ لنگ پیش کرتے ہیں کہ ہم چونکہ ان کے لئے قرضے لے رہے ہیں اس لئے ہم نے انھیں قائم کرنے کی اجازت دی ہے۔ کیا انہوں نے کبھی غور کیا ہے کہ انہیں سود کے ساتھ یہ قرضے ادا کرنے ہیں؟ یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ کسی بھی قرضہ دینے والے ملک سے قرضے کے عوض مشینیں خریدنا دوسرے ذرائع کے مقابلے میں لازماً زیادہ گراں ہوتا ہے۔ چنانچہ ہمیں نہ صرف اس کی خرید کے لئے زیادہ رقم ادا کرنی پڑی بلکہ طرفہ تماشا یہ کہ پہلے سے زیادہ ادا کردہ قیمت پر ہمیں مزید سود بھی دینا پڑا۔ یہ سب کچھ بلاشبہ ہماری کھال اتارتے رہے اور ہم نے اس عمل کو یوں پسند کیا کہ ہماری پالیسی بنانے والوں نے یہی راستہ منتخب کیا تھا۔

ہماری صنعتی ترقی کے دوسرے مرحلے میں ایسی صنعتوں کا قیام ضروری تھا جو مقامی طور پر دستیاب ہونے والی خام اشیاء پر مبنی ہوتیں۔ ہمارا مطمحِ نظر اپنی "کھڈیوں کی صنعت" اور دوسری چھوٹی اور متوسط قسم کی صنعتوں کا تحفظ اور حوصلہ افزائی ہونا چاہیئے تھا۔ اس طرح جہاں تک سوتی پارچہ جات کا تعلق ہے ہم صرف سوت بننے والے کارخانے کھولتے اور اس طرح کھڈی کا کام کرنے والوں کی صنعت کو خوشحال بنانے میں مدد دیتے اور انہیں ان کا خام مال یعنی سوت مہیا کرتے رہتے اور عوام میں کھڈی کے بنے ہوئے سوتی پارچہ جات کے استعمال کو مقبول بنانے کے لئے نشر و اشاعت کے ذریعے استعمال کئے۔ اس قسم کی مثالیں اعلیٰ سطح پر قائم ہونی چاہئیں تھیں۔ یعنی صدر، کابینہ کے وزراء، سکریٹری، شعبوں کے نگراں سے لے کر حکومت کے سب سے چھوٹے عملے تک یہی کپڑے استعمال کرتے۔ اگر اس قسم کی کوئی مثال قائم ہو جاتی تو عوام الناس بھی اس پر عمل کرتے۔ ہوزری کی صنعت کو آسانی سے انڈسٹریل ہوم میں قائم کیا جا سکتا تھا اور بڑے شہروں اور چھوٹے قصبوں میں اسے فروغ دیا جا سکتا تھا۔ اس طریقے سے ایسی عورتوں کو بھی روزگار مل جاتا جن کے پاس فاضل وقت ہوتا ہے۔ اس سے ہزاروں خاندان گھر بیٹھے روزی حاصل

کر سکتے تھے اس سے جلد ہی "فنی معلومات" بھی عام ہو جاتیں اور "گھریلو آرٹ" کی صورت اختیار کر جاتیں۔ اور برآمد کے لیے اچھی قسم کی ہوزری تیار ہونے لگتی جس طرح جاپان میں کیا گیا تھا۔

بڑے بڑے شکر کے کارخانے قائم کرنے پر کروڑوں روپیہ خرچ کرنے کے بجائے ان علاقوں میں باکفایت یونٹ قائم کیے جا سکتے تھے جہاں گنے کی کاشت قرب وجوار میں کی جاتی ہو۔ آئی۔ڈی۔بی۔پی۔ کو چاہیے تھا کہ وہ گنے کے کاشتکاروں کے لیے رس نکالنے کی مشینیں درآمد کرتی اور اقساط پر انہیں فروخت کرتی۔ اس طرح صنعت ہمہ گیر صورت اختیار کر جاتی اور چند ایک کے بجائے متعدد خاندانوں میں خوشحالی آجاتی۔ ان چھوٹے یونٹوں میں ایک خرابی ضرور ہے کہ ان سے عمدہ قسم کی سفید شکر کا حصول ممکن نہیں ہے۔ لیکن جہاں تک قوم کی صحت کا تعلق ہے یہ ظاہراً خامی ایک بہت بڑی خوبی بلکہ ایک پوشیدہ نعمت ہے۔ گنے کا رس نکالنے اور شکر بنانے کی مشینوں کے مقابلے میں شکر صاف کرنے کی مشینیں کہیں زیادہ گراں ہوتی ہیں۔ مزید برآں صاف شدہ شکر صحت کے لئے نقصان رساں ہے۔ یورپ میں لوگوں نے غیر صاف شدہ شکر کا استعمال شروع کر دیا ہے۔ ہمارے عوام کو یہ باور کرانا مشکل نہیں تھا کہ وہ بھی سفید صاف شدہ شکر کے بجائے بھوری شکر کی پذیرائی کریں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی وجہ سے کروڑوں روپے کی مالیت کے زرمبادلہ اور ان قرضوں کی بچت ہوتی جو اتنے بھاری ہو گئے ہیں کہ صرف کوئی معجزہ ہی پاکستان کو ان کے بوجھ سے نجات دلا سکتا ہے۔

ہمارے صنعتی منصوبہ گروں کی "معقولیت" کا اندازہ اس حقیقت سے کیا جا سکتا ہے کہ اگرچہ نئے یونٹ کی لاگت کے ایک تہائی سرمایے سے موجودہ کارخانوں کی گنجائش میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن وہ محض زرمبادلہ میں تین گنا زائد لاگت سے نئے کارخانے کھولنے کی اجازت دیتے رہے ہیں۔ اس کا موازنہ مجموعی لاگت یعنی زرمبادلہ اور مقامی سرمایہ سے کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اگر موجودہ کارخانوں کی پیداواری گنجائش بڑھائی جائے تو مجموعی لاگت کا محض چھٹا حصہ صرف ہو گا۔ اس بات کو یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ ایک کروڑ کے مقامی سرمایہ

کے ساتھ ساتھ ایک کروڑ پچاس لاکھ کے زرِ مبادلہ سے ۱۰۰۰ ٹن گنجائش کا ایک نیا کارخانہ قائم کرنے کی بجائے ۱۰۰۰ ٹن کے ہر موجودہ یونٹ کو بیس لاکھ کا زرِ مبادلہ دے کر ان کی گنجائش دو ہزار ٹن تک بڑھائی جا سکتی ہے، کیونکہ شکر کے ایک نئے کارخانے پر مجموعی لاگت تین کروڑ آتی ہے۔

متعدد صنعتیں جو زرِ کثیر سے قائم کی گئی ہیں اور جو اپنے مزدوروں کے مسائل اور بھاری قومی قرضوں کی حامل ہوتی ہیں، انہیں مختلف طرز پر کم لاگت اور زیادہ افادیت کے ساتھ قائم کیا جا سکتا تھا۔ پھر یہ حقیقی معنوں میں قومی سرمایہ ہوتیں جن کا تعلق ہماری آبادی کے بڑے حصے سے ہوتا اور جن کی بدولت آج صنعتوں میں ملازم افراد کے مقابلے میں کم از کم تین یا چار گنا افراد کو روزگار مل سکتا تھا۔ پیداوار سے متعلق مزدوروں کے فاضل اخراجات کو مشینوں کی خریداری میں بچنے والے سرمائے اور مشینوں کی خریداری کے سلسلے میں لئے جانے والوں قرضوں کے قابلِ ادائیگی سود کی بچت سے پورا کیا جا سکتا تھا۔ ہمارے ملک میں افرادی طاقت کو روزگار مہیا کرنا ہمارا بنیادی مقصد ہونا چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ چین میں مزدوروں کی بچت کرنے والی انتہائی قیمتی مشینیں استعمال نہیں کی جاتی ہیں۔ اعلیٰ ترقی یافتہ اور گراں قیمت مشینوں سے ہمارے عوام کو ہرگز اطمینان بخش روزگار مہیا نہیں ہو سکے گا بلکہ درحقیقت اس سے مسئلہ کی نوعیت اور سنگین ہو جائے گی نیز مالی اعتبار سے بھی زیادہ لاگت برداشت کرنی پڑے گی۔ اس حکمتِ عملی پر چلتے رہنا ایسا ہے جیسے اشرفیوں کی خیرات اور کوئلوں پر مہر۔

مغربی طرز کی منصوبہ بندی سے مختلف یہ بالکل "نئی قسم کی منصوبہ بندی" ہماری ضرورتوں کے مطابق ہے یا جیسا کہ صدر ایوب خاں کہا کرتے تھے "ہمارے عوام کی سوجھ بوجھ کے عین مطابق ہے"۔ کثیر مقدار میں غیر ملکی قرضے لئے بغیر خود اپنے محدود وسائل میں رہ کر اس منصوبہ بندی کے لئے انتہائی محنت کرنی ہوگی اور زیادہ سنجیدگی سے غور و فکر کرنا ہوگا اور بے پایاں تعاونِ کار کی ضرورت ہوگی تاکہ پاکستان کے لئے مغربی طرز کے منصوبوں کی نقالی میں اب تک جو کچھ ہوا ہے یہ اس سے مختلف اور مفید کچھ ہو سکے۔

ہمیں یہ بتایا جاتا ہے کہ عام طور پر سرمایہ دار اور خصوصیت کے ساتھ نام نہاد بیس خاندان پاکستان کی اصل مصیبت ہیں نیز یہ کہ پاکستان میں جو کچھ غلط کاریاں ہوئی ہیں وہ انہی کی وجہ سے ہوئی ہیں۔ بہت ہی سادگی سے یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ اگر انہیں ختم کر دیا جائے تو پاکستان کی ہر چیز دوبارہ نعمت بن جائے گی لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ صنعتیں قائم کرنے والے رہنماؤں نے یقیناً "اچھا کام کیا" ہے۔ پاکستان کے لئے صنعتی میدان میں انہوں نے جو کامیابی حاصل کی ہے وہ قابل تعریف ہے اور معروضی انداز نظر رکھنے والے متعدد مبصروں نے اس کو سراہا ہے۔ اس امر پر توجہ دینی ضروری ہے کہ صنعتوں کے قیام کے ضمن میں صنعتکاروں کا منصب اور حکومت کی صنعتی پالیسی یکساں چیز نہیں ہیں۔ زراعت اور دیگر گھریلو چرخے کی صنعت کے عوض بھاری صنعت قائم کرنے کی پالیسی بنیادی طور پر غلط تھی۔ لیکن کیا اس سلسلے میں صنعت کاروں کو موردِ الزام ٹھہرانا حق بجانب ہوگا؟ صنعتکاروں کی اپنی کمزوریاں اور کوتاہیاں ہیں لیکن دنیا کو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ انھیں کس قسم کے حالات میں کام کرنا پڑتا ہے۔ حکومت نے ایک طرف تو زراعت کو نظر انداز کیا اور صرف صنعتوں میں دلچسپی لیتی رہی۔ دوسری طرف خود صنعت میں بھی ہموار کارکردگی کا مظاہرہ نہیں ہوا۔ ترقی پذیر صنعتوں کے صاف اور سیدھے راستے میں دانستہ مزاحمتیں، بے بنیاد دعوے، سرد مہری اور بھاری رشوتیں غرض کہ ہر ممکن رکاوٹیں پیدا کی گئیں۔ پاکستان میں سب سے مشکل کام سرکاری محکموں سے نمٹنا ہے، جہاں بدعنوانی ایک طرز زندگی بن چکی ہے۔

میں اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ چند ایک کے سوا جو حکومت کی نظر میں اچھے ہیں درحقیقت ایک صنعت کار صنعت قائم کر کے اپنی زندگی کی مدت کم کر لیتا ہے۔ ہمارے بیشتر صنعتکار "دل کے مریض" ہو گئے ہیں جبکہ بعض عالم جوانی میں انتقال کر گئے ہیں۔ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے پاس بہت دولت اور تعیش کا سامان تھا؟ نہیں اپنی دولت کی وجہ سے نہیں بلکہ وہ مسائل اس کے ذمہ دار ہیں جن سے وہ دوچار رہے

پاکستان میں ایک صنعت قائم کرنے میں جتنے مسائل اور پریشانیاں پیش آتی ہیں۔ وہ یورپ میں اسی قسم کی کم از کم پانچ صنعتوں کے قیام کے سلسلے میں پیش آتی ہیں۔

دیانت داری کا تقاضا ہے کہ انسان ہر چیز کا دیانت دارانہ جائزہ لے۔ خصوصاً اگر انسان خدا اور "یوم حساب" پر ایمان رکھتا ہے۔ ورنہ قرآن پاک میں پہلے ہی ارشاد کیا جا چکا ہے کہ "جو لوگ خدا کو فریب دینے کی کوشش کرتے ہیں وہ در اصل خود کو فریب دیتے ہیں"۔

اگر میں یہ خیال کر دوں کہ ہمارے تمام صنعت کار "فرشتہ سیرت" ہیں تو یہ میری بڑی غلطی ہوگی۔ انہوں نے جو کامیابی حاصل کی ہے اس کی تعریف و تحسین کے ساتھ ساتھ اس نقصان کی بھی واضح الفاظ میں مذمت کی ضرورت ہے جو انہوں نے ملک کو پہنچایا ہے۔ ان میں سے بعض نے پاکستان کے جہاں وہ رہتے، جدوجہد کرتے اور خوشحالی حاصل کرتے ہیں بنیادی تصور اور نصب العین کو فراموش کر دیا۔ گزشتہ ادوار کی بدعنوان حکومتوں کے ساتھ مل کر ان میں سے بعض نے بدعنوانی کے طریقے اپنانے کی کوشش کی۔ بعض نے شادیوں اور دوسری تقریبات پر بے دریغ دولت خرچ کی۔ ان کی دولت کے مظاہرے اور اخراجات کے غلط راستے گزشتہ حکومتوں کی غلط کاریوں پر پردہ ڈالتے رہے۔ خدا اور پاکستان کے ضمن میں ان پر جو فرائض عائد ہوتے تھے ان سے بھی روگردانی کی۔ یہی وجہ ہے کہ بزدلی اور باہمی چشمکوں، حسد ایک دوسرے کی مذمت اور افتراق کی صورت میں ان پر عذاب الٰہی نازل ہوا ہے۔ خود حفاظتی کی اچھی اور معقول بنیادوں کے باوجود وہ اپنا تحفظ کرنے سے قاصر ہیں۔ ان کی انتہائی خود غرضی اور الحاد کی وجہ سے خدا نے بلاشبہ انہیں ٹھکرا دیا ہے۔ "خدا کی راہ میں" استعمال کرتے اور "پاکستان کی نظریاتی مملکت" کے مجوزہ مقاصد کا پرچار کرنے کے لئے خدا نے انھیں ذرائع اور وسائل کی صورت میں "بہت بڑا موقع" عطا کیا ہے لیکن نہ صرف یہ کہ وہ ان مقاصد کو عام کرنے میں ناکام رہے بلکہ اپنی دولت کا انتہائی غلط استعمال کیا اور پاکستان کے اخلاقی انحطاط میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

چونکہ انھیں اسلام سے کوئی محبت نہیں اس لئے وہ اسلام سے زبانی ہمدردی کرتے رہتے ہیں۔ وہ مغرور ہیں اور پُرتعیش اور بے راہ روی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ عوام کے مابین منصفانہ تعلقات قائم کر کے وہ اپنی دولت کے ذریعے اسلام کے سُنہری اُصولوں کی تبلیغ کر سکتے تھے اور اس طرح اس کی نعمتوں سے استفادہ کے علاوہ دُنیا اور عقبیٰ کی راحت حاصل کر سکتے تھے۔ لیکن اب وہ کہیں کے بھی نہیں رہے۔

ان کی غیر معمولی کامیابیاں بلاشبہ ان کی صلاحیتوں کی دلیل ہیں لیکن یہ محض مادّی کامیابیاں ہیں اور کسی قسم کی زندگی، روح، اخلاقی شعور اور سماجی ذمّہ داری سے عاری ہیں۔ چونکہ انہوں نے خالص ذاتی مفادات کی خاطر شر پسند حکومتوں کی حمایت کی ہے اس لئے ان کی کامیابیاں ان کے لئے لعنت بن گئی ہیں۔ انھوں نے کبھی مُلک کے مفاد کے بارے میں سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ انہی کی حوصلہ افزائی اور دولت سے نائٹ کلب فروغ پا رہے ہیں اور ہمارے معاشرے میں بدترین خواہشات جنم لے رہی ہیں۔ مغرب میں سماجی انتشار اس اخلاق اور انصاف سے عاری، مادّی خوشحالی کی وجہ سے آیا ہے اور ہمارے معاشرے میں بھی اس کا آغاز ہو چکا ہے۔ ہماری مملکت کے بُنیادی اُصولوں سے غدّاری اور مُلک میں متعدد سماجی برائیوں کی افزائش کی سراسر ذمّہ داری ہمارے بدعنوان سرکاری افسروں اور ہمارے دولت مند طبقے پر عائد ہوتی ہے۔

یہ ایک طویل تمہید تھی۔ اب اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے میں یہ عرض کروں گا کہ صنعت کے شعبے میں ہمیں از سرِ نو انقلابی خطوط پر غور و فکر کی ضرورت ہے تاکہ ہم مستقبل کی صنعتی منصوبہ بندی بالکل نئے طرز پر کر سکیں۔ مجھے یقین ہے کہ ہم آج بھی اپنی جد و جہد کی سمت بدل کر اپنی سنگین غلطیوں کا ازالہ کر سکتے ہیں۔ پارچہ بافی کی جو صنعتیں قائم ہو چکی ہیں ان کے سلسلے میں مکمل برآمد پر ہمیں غور کرنا چاہیے۔ ہمیں سوت کی زیادہ سے زیادہ تیاری پر توجہ دینی چاہیے۔ تاکہ ہم اپنی کھڈی کی صنعت کو سوت مہیا کر سکیں۔ مقامی استعمال کے لئے صرف موٹے کپڑے

کی فراہمی کی اجازت دینی چاہیئے اور وہ بھی اس مدت کے لئے ہو جس کے دوران ہماری کھڈی کی صنعت دوبارہ بحال ہو سکے۔ چرخے کی صنعت کو ہر طرف سے حمایت ملنی چاہیئے اور تمام سرکاری ملازمین پر یہ پابندی عائد کی جائے کہ وہ ہاتھ کے بُنے ہوئے کپڑے پہنیں۔ نشر و اشاعت کے تمام ذرائع سے ہمہ گیر پیمانے پر اس کا پرچار کیا جائے تاکہ عام لوگ بھی ہاتھ کا بُنا ہوا کپڑا پہننے کی طرف مائل ہوں۔ ہمارے عوام کو۔ خواہ امیر ہوں خواہ غریب — یہ بتانا چاہیے کہ اگر وہ آزادی کی فضا میں زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں تو وہ اس ذرا سی قربانی سے کام لے کر خود اپنی صنعت کی ترقی میں ہاتھ بٹائیں۔

شکر کے نئے کارخانوں کے قیام کا مسئلہ ہو یا دوسری قسم کی صنعتوں کا ہمیں چاہیے ہم نئی صنعتوں کی نئی بنیادوں پر منصوبہ بندی کریں۔ زراعت پر مکمل ارتکاز توجہ کے بعد نئی صنعت کے قیام کا سلسلہ شروع ہونا چاہیے۔ زراعت یا چرخے کی صنعت کیلئے سوت فراہم کرنے والی صنعتوں کے سوا فی الحال ہر قسم کی نئی صنعت کے قیام کو آئندہ پانچ سال یا کم از کم ہمارے زرعی منصوبوں کی کامیابی تک ممنوع قرار دیا جائے۔ زراعت کو مقدم قرار دے کر اگر ہم اپنی مستقبل کی صنعتی پالیسی کو از سر نو مرتب کریں اور متعلقہ صنعت کے کم خرچ یونٹ دیہی پیمانے پر قائم کریں تو ہم لاکھوں افراد کو روزگار مہیا کر سکتے ہیں۔ اسی طرح دستکاری، کھیل کے سامان، آلات جراحی، پیتل کے ظروف، بنارسی سلک کی ساڑھیوں اور کشیدہ کاری جیسی گھریلو صنعتوں کو بھی بیج خرد سازی کی صنعت کے خطوط پر فروغ دیا جائے۔ توقع ہے کہ اس عملی طریق کار کے ذریعہ ملک کی تمام تر صنعتی صورت حال کو تبدیل کیا جا سکتا ہے اور اس طرح معیشت اور معاشرے کے لئے اسے حقیقی معنوں میں مُفید بنایا جا سکتا ہے۔

صنعتی پالیسی اور انتظامیہ کا ایک اور پہلو بھی ہے جو بہت ذمہ دارانہ غور و فکر اور ایک فوری حل طلب مسئلہ ہے اس کا تعلق منافع جات اور اُجرتوں کی پالیسی سے ہے۔

صنعتی تنازعات اور مزدوروں کی بے چینی کا تمام تر مسئلہ صرف ایک سوال کے

گرد گھومتا ہے کہ مزدور کے "دیانت دارانہ" اور "منصفانہ" صلہ سے مراد کیا ہے۔ تیاری کے عمل میں متعدد عوامل اور عناصر کار فرما ہوتے ہیں جن کے نتیجے میں مصنوعات تیار ہوتی ہیں اس عمل میں حصّہ لینے والے ہر فرد کو منصفانہ معاوضہ دیا جانا چاہئے اور کسی کو بھی دوسر کا حق چھیننے کی اجازت نہیں دینی چاہئے۔ ہر شخص کے ساتھ دیانت دارانہ برتاؤ ہونا چاہئے۔ اس مسئلے کو اس انداز سے حل کیا جائے کہ اوقاتِ کار اور وسائل کے نقصان نیز معاندانہ تعلقات جیسے روزمرّہ کے تلخ واقعات ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیں۔ یہ مسئلہ کافی پیچیدہ ہے اور چونکہ اس میں ہر شخص کا ذاتی مفاد بھی پوشیدہ ہوتا ہے اس لئے اس کا حل تقریباً ناممکن نظر آتا ہے لیکن اگر ہم ذاتی مفاد کی پست سطح سے اُبھر آئیں تو اسلامی معاشرے کی اقدار کی روشنی میں ان کا حل تلاش کرنا کوئی ناممکن کام نہیں ہے۔

میں اس مسئلے کے نظری پہلوؤں سے بحث کرنا نہیں چاہتا لیکن عملی حیثیت سے کم از کم چار فریق ایسے ہیں جن کے مفادات کا تحفظ ضروری ہے۔ چنانچہ ایسے طریق کار اختیار کئے جائیں جو سب کے لئے حقیقی معنوں میں منصفانہ ہوں۔ وہ فریق یہ ہیں:۔

(ا) حکومت، جو پیداوار پر بالواسطہ اور بلاواسطہ محاصل کی شکل میں سب سے زیادہ حصّہ لے جاتی ہے۔

(ب) سرمایہ کار، جن میں اعلیٰ درجے کی انتظامیہ بھی شامل ہے اور جسے انجام کار منافع ملتا ہے۔

(ج) مزدور (اُجرت اور تنخواہ پانے والے) جنھیں باہمی رضامندی کے مطابق معاوضہ ملتا ہے لیکن جو بجا طور پر اپنے حاصل کردہ حصّے سے نامطمئن ہوتے ہیں کیونکہ خصوصیت کے ساتھ نچلی سطح کے مزدوروں کی اُجرت اتنی کم ہوتی ہے کہ وہ اپنی اور اپنے خاندان کی معقول طور پر گزر بسر نہیں کر سکتا۔

(د) صارفین، جن پر اشیاء کی قیمت کی صورت میں حقیقی بوجھ پڑتا ہے۔

ہماری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ ایک ایسا حل تلاش کیا جائے جو سب کے لئے منصفانہ ہو۔ اگر حکومت اور سرمایہ کار ایک منصفانہ اور انسان دوست معاشرے کے قیام کی خاطر اپنے حصّے کی کچھ مقدار کا ایثار کرنے کو تیار رہوں تو انشا اللہ مساویانہ بنیادوں پر ایک معاشرہ قائم ہو سکتا ہے اور مجھے پورا یقین ہے کہ آگے چل کر زیادہ پُر امن زندگی، اخوت، زیادہ پیداوار اور عام بہبود کی صورت میں سب کو اس سے بہت فائدہ حاصل ہوگا۔ یہی وہ شعبہ ہے جس میں ہم دوسروں کے سامنے ایک مثال پیش کر سکتے ہیں کیونکہ دُنیا کے معاشی طور پر ترقی یافتہ ممالک خواہ سرمایہ دار ہوں خواہ اشتراکی، اس مسئلے کا حقیقی حل تلاش کرنے میں ناکام رہے ہیں۔

اس قسم کا حل حسبِ ذیل خطوط پر تلاش کیا جا سکتا ہے:۔

(۱) صارفین اور کم آمدنی والے طبقوں پر براہ راست یا بالواسطہ ٹیکس عائد کرنے سے جو بوجھ پڑتا ہے اس کی روشنی میں ٹیکس کے نظام پر نظر ثانی کی جائے۔

(۲) تمام صنعتی اداروں میں مزدور کو بھی منافع میں شریک کرنے کا اصول اپنایا جائے۔ سرمایہ کار اور مزدور کے متعلقہ حصوں کا تعین کابینہ یا قومی پارلیمنٹ کرے۔ یہ حصّہ مزدور کو اس کی عام اُجرت کے علاوہ ملنا چاہیئے۔ اس انقلابی تبدیلی کے بعد بونس کے طریقے کو بہر حال ختم کر دیا جائے۔

(۳) کم سے کم اُجرتیں مقرر کی جائیں اور ایک ایسا نظام نافذ کیا جائے جس میں عام قیمتوں کے انڈکس میں تبدیلی کے پیشِ نظر اُجرتوں کی پالیسیوں میں بھی حالات کے مطابق رَدّ و بدل ہونا چاہیے۔

تمام متعلقہ فریقین کے نمائندوں کے باہمی صلاح مشورے سے اِن اصولوں کی بُنیاد پر ایک حتمی فارمولا تیار ہو اور اسے ہر سطح پر نافذ کرنا چاہیئے۔ اگر ہم اس مقصد میں کامیاب ہو گئے تو ہمارا ملک دُنیا کا پہلا ملک ہوگا جو تجارت و صنعت کے منافعوں میں مزدوروں کی حقیقی اور براہِ راست شرکت کے نظام کو متعارف کرائے گا۔ مجوزہ انقلابی تبدیلی کے

ایک یا دو پہلوؤں کی مزید وضاحت کی میں کوشش کروں گا۔

اُجرتوں کا جہاں تک تعلق ہے، ان میں بازار کے رجحان کے مطابق ردّ و بدل ہونا چاہیئے اس امر کی ضمانت ہو کہ قانوناً کم سے کم اُجرت مقرر کی جائے اور اُجرتوں کے تعین کا ایک نظام وضع کیا جائے۔ مزدوروں کے تمام تنازعات کی جڑ حقیقی معنوں میں لچکدار اور ہمیشہ اضافہ پذیر قیمتیں اور نسبتاً جامد قسم کا اُجرتی نظام ہوتا ہے۔ میری تجویز یہ ہے: قیمتوں کے حقیقی اُتار چڑھاؤ کی مستقل نگرانی کرنے کے لئے حکومت کو ایک مستقل محکمہ قائم کرنا چاہیئے۔ ہر سال کے آخری دن یہ اعلیٰ اختیارات کا ادارہ یہ اعلان کرے کہ اخراجاتِ زندگی میں حقیقی اضافہ کتنا ہوا ہے اور اس امر کا فیصلہ بد دیانتی پر نہیں بلکہ دقتِ نظر اور معروضی تحقیق کی روشنی میں ہونا چاہیئے۔ اور ساتھ ہی ساتھ عوام کے لئے اس کا اعلان ہونا چاہیئے۔ مزدور کو ملازم رکھنے والے ہر ادارے کو قانونی طور پر خود بخود اُجرتوں میں اسی تناسب سے اضافہ کرنا چاہیئے جس تناسب سے اخراجاتِ زندگی میں اضافہ ہوا ہے۔ یہ ایک خودکار نظام بن جائے گا اور اس کی وجہ سے پاکستان میں آئے دن میں جو تنازعات ہوتے رہتے ہیں وہ ختم ہو جائیں گے۔ بعض مغربی ممالک نے بہت کامیابی کے ساتھ اُجرتوں کے تعیّن کے اس نظام پر عمل درآمد کیا ہے اور مزدور اور انتظامیہ کے تنازعات کا خاتمہ کر دیا ہے۔ سوئٹزرلینڈ اس کی ایک مثال ہے جہاں اسکی سالانہ بُنیاد رکھی گئی ہے۔ سکنڈی نیویا کے بعض ممالک میں اس کی بُنیاد دو یا تین سال ہے۔ پھر ہم کیوں نہ اس قسم کے نظام کو اختیار کریں اور ہمارے معاشرے میں جو تکلیف دہ تنازعات ہوتے ہیں ان سے نجات حاصل کر لیں۔؟ سماجی کشمکش معاشی جنگ اور طبقاتی تصادم کو ہوا دے کر امن اور خوشحالی حاصل نہیں کی جا سکتی بلکہ باہمی تعاون، باہمی اشتراک اور منصفانہ سلوک کے ذریعے اس کا حصول ممکن ہے۔

میری تجویز کے دوسرے حصّے کا تعلق تجارتی منافع میں مزدور کی شرکت سے ہے۔ سرمایہ کاروں اور مزدوروں کے مابین منافعوں کے تناسب کا تعیّن پارلیمنٹ کے کسی قانون یا

کم از کم کابینہ کے فیصلے کے ذریعہ کیا جائے اور تمام ملک میں یکساں طور پر اسے نافذ کیا جائے۔ کسی شخص کو بھی اپنی مرضی کے مطابق اس میں ردّ و بدل کرنے کی اجازت نہیں ہونی چاہئے۔ مزدور کو بونس دینے کے موجودہ طریقے کو ختم کر کے منافع میں شراکت کے مساویانہ نظام کو رائج کیا جائے۔ مزدوروں سے منصفانہ سلوک کے ہمہ جہتی مطالبوں پر سنجیدگی سے غور و فکر کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مزدور کو اپنی معمول کے مطابق تنخواہ کے علاوہ تجارتی ادارے کے منافع کا ۲۵ فیصد ملنا چاہئے۔ سرمایہ کاری، منصفانہ منافع، معقول قیمتیں اور سماجی فلاح و بہبود کے مابین حقیقی توازن قائم رکھنے کے لئے یا تو حکومت کو ٹیکس کے نظام کو از سرِ نو مرتب کرنا چاہئے یا کم از کم اس ۲۵ فیصد رقم کو آمدنی اور منافع کے ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دیا جائے جو مزدوروں کو تقسیم کی جاتی ہو*۔ اس نئے نظام کی تشکیل و تعمیر اور عوام کے معیارِ زندگی کو معقول حد تک بہتر بنانے کے لئے مساویانہ ایثار و قربانی درکار ہوگی۔ جہاں تک مینیجنگ ایجنٹوں کا تعلق ہے۔ میری تجویز یہ ہے کہ ان کے حصے پر بھی دیانت داری سے نظرِ ثانی کی جائے اور اس ضمن میں جو بدعنوانیاں راہ پا گئی ہیں انھیں ختم کر دیا جائے۔ اس وقت مینیجنگ ایجنٹوں کو پانچ سے سات فی صد تک حصہ ملتا ہے، اور اپنے عملے، کرایے اور پوسٹ آفس وغیرہ کے اخراجات کے بعد ان کے پاس کچھ بھی باقی نہیں رہتا ہے۔ پھر جو کچھ انہیں ملتا ہے اس سے وہ مطمئن کیوں ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے "دوسرے ذرائع" اختیار کرتے ہیں اور ایسا صرف اس وجہ سے ہوتا ہے کہ حکومت یہ کہتی ہے کہ "اگر تم دیانت دار رہو گے تو میں تمھیں تباہ کر دوں گی اور جب تک دیانت داری سے قطع نظر کر کے تم اپنی گنجائش کے مطابق زیادہ سے زیادہ کماتے

---

* یہاں مجھے اس امر کی وضاحت کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ مزدور سے میری مراد معاشی مفہوم میں استعمال ہونے والی افرادی طاقت سے ہے جس میں مزدور، سپروائزر، سکریٹریوں کا عملہ، مہارت یافتہ یا خصوصی تربیت یافتہ افرادی طاقت، فیکٹری منیجر وغیرہ شامل ہیں۔ اس میں بہر حال مینیجنگ ایجنٹس شامل نہیں ہیں جن سے علیحدہ بحث کی گئی ہے۔

ہے، میں اپنی آنکھیں بند رکھوں گی۔"

[انتظامیہ کے لیے کل منافع کا دس فیصد موزوں تناسب رہے گا جسے مزدوروں سے متعلق بنیاد کے مطابق ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ اگر انھیں مزید دس فیصد نہ ملے، جو اگرچہ مختصر رقم ہے لیکن ٹیکس کی معافی کے بعد مناسب ہو جاتی ہے، تو پھر وہ کیوں گدھوں کی طرح کام کریں اور مالیات اور انتظام و انصرام کے بے شمار مسائل اپنے سر پر مسلّط کر لیں؟۔ وہ بھی دوسرے عام حصص دار کی طرح اپنا سرمایہ کاروبار میں لگا سکتے ہیں اور آرام کی زندگی بسر کر سکتے ہیں۔

اگر ایک بار حکومت اور عوام ایمانداری اور انصاف کے راستے پر چلنے کا تہیّہ کر لیں اور ایسی پالیسیاں اختیار کریں جو سب کے لئے منصفانہ ہوں تو مشکل آسان ہو جائے گی اور ہمارے متعدد مسائل حل ہو جائیں گے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ کتاب کے اس حصّے میں جو تجاویز میں نے پیش کی ہیں ان پر بیشتر متعلقہ جماعتوں کی طرف سے اعتراضات ہوں گے۔ حکومت کہے گی کہ اس کی محصول آمدنی پر اثر پڑے گا۔ صنعتکار اس لئے ناخوش ہونگے کہ انھیں اپنے منافعوں کے ایک بڑے حصّے سے دستبردار ہونا پڑے گا۔ یہاں تک کہ مزدور لیڈر بھی ایک ایسی حکومت سے ذاتی طور پر خوش نہیں ہونگے جو اس پالیسی کو نافذ کرنا چاہتی ہو۔ لیکن میرا معروضہ یہ ہے کہ ذاتی مفاد کو ترک کر کے وسیع تر مفاد کی خاطر ایثار کیا جائے۔ ہمارے ساتھ دقّت یہ رہی ہے کہ ہم کوتاہ بینی کے عادی رہے ہیں اور صرف اپنے ذاتی مفادات کو عزیز رکھتے ہیں۔ اگر مسائل کو ان کے وسیع تر پس منظر میں دیکھا جائے تو درحقیقت کسی شخص کے ذاتی مفادات اور معاشرے اور انسانی برادری کے وسیع تر مفادات میں کوئی تصادم نہیں ہے۔ اور ایک مسلمان کے لئے تو یہ پس منظر اور بھی وسیع ہے۔ اسے دنیا اور آخرت دونوں جگہ کے مفادات میں ہم آہنگی پیدا کرنا پڑتی ہے۔ میں نے جو پالیسی تجویز کی ہے وہ کسی ایک گروہ کے فوری اور ذاتی مفادات کی بندگی پر مبنی نہیں ہے۔ دنیا اور آخرت میں سب کے لئے بہترین مفادات کے تصور پر مبنی ہے۔

باب پنجم

تعلیمی انقلاب

جنوبی کوریا کو ایک تباہ کن جنگ کا سامنا کرنا پڑا۔ تاہم جنوبی کوریا کی ناخواندگی کی شرح ۲۵ فیصد کم ہو چکی ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ خواندگی کی شرح میں مزید ۵۰ فیصد کا اضافہ ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ۷۵ فیصد آبادی خواندہ ہے۔ اگر جنوبی کوریا یا کوئی اور غیر ترقی یافتہ ملک مختصر سی مدت میں کوئی غیر معمولی کارنامہ سرانجام دے سکتا ہے تو ہم پاکستان کے لوگ ایسا کیوں نہیں کر سکتے؟

اگر زرعی انقلاب ہماری مستقبل کی قومی ترقی کا ڈھانچہ مہیا کر سکتا ہے تو تعلیمی انقلاب اس کی تکمیل کے لئے یقیناً ایک بنیاد فراہم کرے گا۔

تعلیم ایک نظریاتی اور ثقافتی ضرورت ہے۔ یہ ہر فرد کا پیدائشی حق ہے اور وہ معاشرہ جو اپنے تمام اراکین کو تعلیم مہیا کرنے سے قاصر رہتا ہے، ایک مہذب معاشرہ کہلانے کا ہرگز مستحق نہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ تعلیم ایک محض ثقافتی بھلائی نہیں ہے بلکہ معاشی اور سماجی ترقی میں بھی اس کا منصب بے پایاں ہوتا ہے۔ وہ دن ختم ہو گئے جب تعلیم کو امراء کا "مصرف" یا "تفریح طبع" کا باعث سمجھا جاتا تھا۔ ہمارے زمانے کی معاشی فکر میں ایک انقلاب برپا ہو چکا ہے اور اب تعلیم کو انسانی معاشرے کی رُوح سمجھا جاتا ہے۔ دُنیا بھر میں جو اہم تحقیقی کام ہوئے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ زرعی اور صنعتی ترقی کی محرک تعلیمی ترقی ہے۔ اگر ہم جدید ماہرین معاشیات کا اعتبار کریں تو ان کا کہنا یہ ہے کہ قومی آمدنی میں تقریباً

میں سے پچیس فیصد اضافہ تعلیم کی وجہ سے ہوتا ہے۔ بعض نے ثابت کیا ہے کہ سماجی اور ثقافتی فوائد کا تو ذکر ہی کیا، فرد کو تعلیم دینے کی وجہ سے (اعلیٰ کارکردگی اور بہتر آمدنی کے ذریعے) فرد کو اور مجموعی حیثیت سے (معاشی ترقی اور دیگر عوامل کے ذریعہ) پوری معیشت کو جو فوائد حاصل ہوتے ہیں وہ فرد یا معیشت کو جسمانی محنت سے حاصل ہونے والے فوائد کے برابر بلکہ ان سے بڑھ کر ہوتے ہیں۔ اور جہاں تک غیر ترقی یافتہ ممالک کا تعلق ہے' ناخواندگی اور افرادی طاقت کی مناسب تعلیم و تربیت کی کمی سے ان کی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ ایک مصنف کے قول کے مطابق "نئے ترقی پذیر ممالک کا کلیدی مسئلہ بنیادی طور پر سرمائے کی قلت نہیں بلکہ پیداوار اور اس کی تنظیم کے شعبوں میں افراد کی صلاحیتوں کا ہمہ گیر اور ناہموار نقصان ہے۔

لہٰذا مسئلے کو خواہ ثقافتی اور نظریاتی نقطہ نظر سے دیکھا جائے خواہ معاشی نقطہ نظر سے قومی ترقی میں تعلیم کی اہمیت مسلم ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ہمارے وسائل کا کتنا حصہ اس کے لئے وقف کیا گیا ہے اور اسے ہماری قومی ترجیحات کی فہرست میں کیا مقام حاصل ہے؟ مجبوراً یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس کی حقیقی اہمیت کو کبھی تسلیم نہیں کیا گیا ہے۔ تعلیم کے ساتھ سوتیلی ماں سے زیادہ بدتر سلوک کیا گیا ہے۔

ہمیں دیہات میں رہنے والے لاکھوں بچوں اور نوجوانوں کو تعلیم دینے کے مقابلے پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔ چنانچہ خصوصی طور پر دیہات میں تعلیم کو فروغ دینے کی غرض سے تعلیمی پالیسی کا از سر نو جائزہ لینا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں ہم ہزاروں مسجدوں سے مدرسوں اور اسکولوں کا کام لے سکتے ہیں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ عزم صمیم کی راہ میں کوئی چیز رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ "پوری قوم" خاص طور سے نئی نسل کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے کے معاملے پر مزید غور و خوض کی ضرورت ہے۔

یہ ملک و قوم کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔ ناخواندگی ہمارے معاشرے کی ایک بڑی لعنت ہے۔ اس لعنت سے چھٹکارا پانے میں ایک دن کی تاخیر بھی ایک بڑا قومی نقصان ہوگا۔

رسول اللہؐ کا ارشاد ہے کہ "ہر مسلمان پر تحصیل علم لازم ہے۔" اسلام میں مسجد صرف ایک عبادت گاہ ہی نہیں بلکہ نہ صرف ایک اچھے شہری بلکہ ایک اچھے مسلمان کی حیثیت سے اپنی انفرادی اور اجتماعی ذمہ داریاں پوری کرنے کے سلسلے میں ایک مرکز کی حیثیت رکھتی ہے۔" عالم کا قلم "شہید کے خون سے زیادہ موثر قوت ہے۔" حصول علم کے بارے میں رسول اکرمؐ کا ارشاد ہے۔ "مہد سے لحد تک تعلیم حاصل کرو۔" یا اگر حصول علم کے لیے تمہیں چین بھی جانا پڑے تو تعلیم حاصل کرو۔ تعلیم کے بارے میں رسول مقبولؐ کے ارشادات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام نے حصول علم کو کس قدر اہمیت دی ہے۔ اسلام میں مسجد کا درجہ صرف ایک عبادت گاہ کی حیثیت سے نہیں اور رسول اللہ یا خلفائے راشدین کے زمانے میں مسجدوں کو صرف عبادت کے لئے مخصوص نہیں کیا گیا۔ مسجد ایک عبادت گاہ، تعلیمی مرکز بلکہ ایک انتظامی مرکز کی حیثیت رکھی تھی۔ غیر ملکی وفود رسول اکرمؐ سے مسجد نبوی میں ملاقات کرتے تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ اپنے عہد خلافت میں مسجد نبوی ہی سے عظیم اسلامی مملکت کے انتظامی اُمور انجام دیتے تھے۔ لہٰذا آج ہم مساجد کو دینی اور ابتدائی تعلیم یا تعلیم بالغان کے لیے مرکز کی حیثیت سے کیوں استعمال نہیں کر سکتے۔" میں لادینی تعلیم کی اصطلاح استعمال کرنا نہیں چاہتا میرے نزدیک لادینی تعلیم کا سرے سے وجود ہی نہیں ہے کیونکہ صحیح تعلیم کا مقصد، فرد کو اس عظیم قوت کے وجود سے باخبر کرنا ہے جو کائنات کا خالق ہے۔ ایسی تعلیم جس کے نتیجے میں فرد، مملکت یا علم کو خدا کا درجہ دے دیا جائے، ذات باری کے وجود سے انکار کے مترادف ہے۔ مسجد ہمارے مذہب کا سب سے بڑا تحفہ ہے جسے ہم کائنات کے مقصد تخلیق کو

خدا کے احکامات کی تعمیل کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔ اسلام دینِ فطرت اور تمام انسانیت کے لیے فطری دین ہے۔

تعلیم کے مقصد کے لیے ہر مسجد میں دینی تعلیم کے لیے کم از کم ایک اُستاد اور ابتدائی تعلیم و تعلیم بالغان کے لیے دوسرے اُستاد ہونے چاہئیں۔ اس سلسلے میں ایک تہائی اخراجات سرپرستوں کو، ایک تہائی حکومت کو ایک تہائی اخراجات علاقے کے متمول افراد کو برداشت کرنے چاہئیں۔ جو متمول افراد تعلیمی اخراجات پورے کریں انہیں مساجد کی انتظامیہ میں شامل کرنا چاہیے۔

ہندوستان میں مسلمانوں نے اپنے ثقافتی اور مذہبی ورثے کو محفوظ رکھنے کے لیے ہر مسجد میں ایک معلم مقرر کرنے کی اسکیم شروع کی تھی، ہر ایک گھر میں کھانا تیار ہونے سے پہلے مسجد کے اخراجات کے لیے ایک مٹھی چاول یا گیہوں علیحدہ رکھ دیا جاتا تھا۔ ہر ہفتے اس طرح جمع ہونے والا اناج نیلام کر دیا جاتا جس سے علاقے کی مسجد کے معلم کے لیے کافی رقم جمع ہو جاتی تھی۔ پاکستان کے ایک ممتاز تاجر جناب سیٹھی متذکرہ بالا اصول پر حفظ قرآن کے آٹھ سو مدرسے پاکستان میں اور دو مدرسے سعودی عرب میں چلا رہے ہیں اور ایسے ہی کئی سو مدرسے دوسرے مسلم ممالک میں کھولنے والے ہیں۔ مدرسوں کے اخراجات کے لیے ایک تہائی رقم سیٹھی ٹرسٹ ادا کرتا ہے، ایک تہائی رقم بچوں کے والدین سے وصول کی جاتی ہے اور باقی ایک تہائی رقم متمول مسلمان ادا کرتے ہیں۔ حفظ قرآن کے ان مدرسوں کا نظم و نسق عطیے دینے والے متمول افراد اور طالب علموں کے سرپرستوں کے ہاتھ میں ہے۔

سیٹھی صاحب کو اس کارِ خیر میں جو کامیابی ہوئی ہے اس کا سبب یہ ہے کہ وہ یہ کام اپنی ذات کے لیے نہیں بلکہ اللہ کی خوشنودی کے لیے کر رہے ہیں چنانچہ اللہ اُن لوگوں کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔ اللہ اُن لوگوں کی بھی مدد کرتا

ہے جو باہمی تعاون کی بنیاد پر دوسروں کی مدد کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں مساجد اور ایسے افراد کی کمی نہیں جو خود کھانے سے پہلے ایک نیک مقصد کے لیے مٹھی بھر اناج رکھ سکیں۔ ہمیں صرف ایسے بے لوث افراد کی ضرورت ہے جو آگے بڑھ کر یہ نیک کام شروع کریں اور دوسروں کو بھی اس میں شرکت کی ترغیب دیں۔ پرانی کہاوت ہے "کہ چراغ سے چراغ جلتا ہے" ایک چراغ روشن ہو جائے تو ملک کے گوشے گوشے میں لاکھوں چراغ روشن ہو جائیں گے۔ حقیقی قائد و رہنما، اقتدار کے بھوکے نہیں ہوتے نہ وہ نجات دہندہ کا لبادہ اوڑھ کر سامنے آتے ہیں بلکہ وہ سیدھے سادے عام افراد ہوتے ہیں اور پیچیدہ اور دشوار ترین قومی مسائل کو سیدھے سادھے طریقے پر حل کرنا چاہتے ہیں۔ اُن کا سر صرف خدا کے سامنے جھکتا ہے اور وہ خدا ہی سے رہنمائی و امداد کے طالب ہوتے ہیں۔

جیسا کہ ہم نے پہلے عرض کیا ہے حقیقی اور صحیح تعلیم کا مقصد صرف یہ ہے کہ کائنات کے مقصد تخلیق کو سمجھا جائے۔ اگر کوئی مسلم مملکت یا حکومت اپنے شہریوں کو اس سلسلے میں تعلیمی سہولتیں فراہم نہیں کرتی تو حکمرانی کی اہل نہیں ہے چہ جائیکہ وہ شہریوں سے ہر قسم کے ٹیکس وصول کرتی رہے۔

اگر ہم خلوص دل سے کام کرنا چاہیں تو ہم اپنے ملک کے عوام اور لاکھوں ناخواندہ بچوں کو تعلیم دے سکتے ہیں۔ مساجد میں قائم ہونے والے مدرسوں سے نہ صرف کفایت کے ساتھ تعلیم فراہم کی جا سکے گی بلکہ یہ مدارس، جدید مدرسوں سے معیار میں بہتر ہوں گے۔ اس مسئلے پر قابو پا کر ہم اپنے ۸۰ فی صد قومی مسائل حل کر سکتے ہیں۔

باب ششم

مسلح افواج میں انقلابی تبدیلیاں

دُنیا کے تمام آزاد ملکوں میں ہر شہری ایک سپاہی ہے۔ ظاہر ہے ہماری مراد ان لوگوں سے ہے جنہیں موجودہ زمانے کی جنگوں میں تمام ضروری ہتھیار استعمال کرنے کی تربیت دی گئی ہو۔ سوئٹزرلینڈ ایک چھوٹا سا ملک ہے جس کی فوج کی تعداد صرف چند ہزار ہے مگر چند گھنٹوں میں وہ پاکستان کی افواج سے بڑی فوج کو طلب کر سکتا ہے۔ اسی طرح اگر پاکستان کے عوام کو فوجی تربیت دی جائے تو قومی ہنگامی ضرورت کے وقت ایک بہت بڑی فوج ملک و قوم کی خدمت کے لئے موجود ہوگی۔ آج دُنیا کے جن ملکوں میں فوج کی تعداد کم ہے اور عوام کو لازمی فوجی تربیت دی جاتی ہے وہ خوش حال ترین ممالک میں شمار کئے جاتے ہیں مشرق اور مغرب میں جاپان اور مغربی جرمنی ایسے دو ملک ہیں جن کی خوشحالی کا سبب یہ ہے کہ ان کی فوج کی تعداد بہت کم ہے۔ بڑی افواج پر بھاری رقم خرچ ہوتی ہے اور ملک کے وسائل محدود تر ہو جاتے ہیں۔

سوئٹزرلینڈ، سویڈن اور ناروے یورپ کے انتہائی خوش حال ممالک میں شمار کئے جاتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں روس اپنی تمام تر فوجی قوت کے باوجود غریب ملک ہے جہاں عوام کا معیارِ زندگی، یورپ کے چھوٹے ملکوں کے مقابلے میں خاصا پست ہے۔ روس کے بیشتر مالی وسائل مسلح افواج پر خرچ ہو جاتے ہیں۔ امریکہ کے صدر نکسن ان حالات سے باخبر ہیں۔ انہوں نے ایشیا کے حالیہ طوفانی دورے میں ایشیائی ملکوں پر واضح کر دیا ہے کہ وہ اپنی دفاعی ذمہ داریاں خود پوری کرنے کی کوشش کریں کیونکہ امریکہ کو اقتصادی بحران سے بچنے کے لئے اپنی مسلح افواج کی تعداد کم کرنی ہوگی۔ امریکی کرنسی کی قیمت میں پہلے ہی کمی ہو چکی ہے۔

چین میں بھی حالات مختلف نہیں ہیں۔ کارخانوں میں کام کرنے والے مرد اور عورتوں کو (بیرکوں) COMMUNES میں رہنا پڑتا ہے کیونکہ چین کے اقتصادی حالات اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ لاکھوں افراد کے لیے مکان تعمیر کیے جائیں۔ قومی وسیلوں کا بڑا حصّہ فوجی مقاصد کے لیے خرچ ہو جاتا ہے۔ پاکستان کو بھی ان حالات و واقعات کی روشنی میں اس مسئلے کا جائزہ لینا چاہیے۔ مسلح افواج پر قومی آمدنی کا بڑا حصّہ خرچ ہو جانے کے باوجود ہنگامی حالات میں خدانہ کرے اگر دشمن افواج ہمارے ملک میں اندر تک داخل ہو گئیں تو عام لوگوں کو لاٹھیوں سے ٹینکوں اور ہوائی جہازوں کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ لوگوں کو فوجی تربیت سے محروم رکھنے کی جان بوجھ کر سازش کی گئی ہے۔ لوگوں کو فوجی تربیت تو کیا دی جاتی، انگریزوں نے دوسری جنگِ عظیم کے دوران کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جو فوجی تربیت کی تھی، پاکستان میں اسے بھی ختم کر دیا گیا جبکہ پاکستان کو ہر وقت ایک دشمن ملک سے خطرہ درپیش ہے۔ سابق صدر نے واضح الفاظ میں کہا تھا کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں فوجی تربیت کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور اس شر پسندانہ بیان کے باوجود وہ عوام کے سامنے جواب دہی سے بچ گئے۔ ایک ایسے وقت جبکہ ہمیں حقیقتاً اپنے ہمسایہ ملک سے خطرہ ہے، جو ہر قیمت پر پاکستان کو تباہ کرنے کے خواب دیکھ رہا ہے اور اپنی جارحانہ فوجی قوّت میں مزید اضافہ کر رہا ہے، ہمیں عوام کو لازمی فوجی تربیت دینی ہوگی۔ کیا ہم اس پر یقین کر سکتے ہیں کہ ہندوستان کی یہ فوجی تیاریاں چین کے خلاف ہیں جبکہ وہ اپنی بھرپور قوّت کے باوجود پاکستان کا بھی مقابلہ نہیں کر سکا۔ کیا ہندوستان واقعی چین سے مقابلہ کر سکے گا جبکہ روس اور امریکہ دونوں چین سے خائف ہیں۔ ہمارے دشمن ہمسایہ ملک ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات معمول بن چکے ہیں اور بے گناہ مسلمانوں کا خون کوئی قیمت نہیں رکھتا۔ مسلمانوں کی جان، مال، عزّت وغیرہ کوئی چیز محفوظ نہیں ہے۔ یہ ایک ناقابلِ معافی جرم ہے کہ حکومت ان تمام باتوں کے باوجود مادرِ وطن کے دفاع کے لیے اپنے ہر ایک شہری کو فوجی تربیت دینے سے چشم پوشی کر رہی ہے۔ درحقیقت ہمارے پاس ملک کے تمام بالغ افراد پر مشتمل ریزرو فوج ہونی چاہیے جو جدید ہتھیاروں کو بخوبی استعمال کر سکے اور امن و جنگ میں

ملک کا دفاع کر سکے۔ کس قدر افسوسناک بات ہے کہ اس وقت عام لوگ لاٹھیوں سے بھی اپنا دفاع نہیں کر سکتے کیونکہ اُنہیں اس کی بھی تربیت نہیں دی گئی ہے۔ جو لوگ اس قومی جرم کے ذمہ دار ہیں تاریخ انہیں ہرگز معاف نہیں کرے گی۔

شمالی ویت نام جیسے چھوٹے سے مُلک نے امریکہ جیسی عظیم فوجی قوت کو تگنی کا ناچ نچا دیا ہے۔ شمالی ویت نام نے چھاپہ مار جنگ کے ذریعہ امریکی افواج کو زبردست جانی و مالی نقصان پہنچایا ہے۔ کئی سال کی لڑائی کے بعد (جس میں ویت کانگ کے خلاف جدید ترین ہتھیار اور بم استعمال کئے گئے) قوت و طاقت کے نشے میں چور امریکی افواج ویت نام سے واپس جا رہی ہیں اور ندامت سے اُن کے سر جھکے ہوئے ہیں۔ امریکہ اس شکست کے بعد چھاپہ مار فوجی ڈویژن قائم کرنے پر غور کر رہا ہے۔

اگر ہمارے عوام کو بھی فوجی تربیت دی جائے (اگر نہیں تو کیوں نہیں؟) تو دُنیا کی کوئی طاقت پاکستان کا مقابلہ کرنے کا خیال تک دل میں نہیں لا سکتی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہماری مسلح افواج بھی جب اپنے غیر فوجی بھائیوں کو اپنے دوش بدوش دیکھیں گی تو ان کے حوصلے بلند ہو جائیں گے۔ ہندوستان اور اس کے اتحادی، پاکستان کی مقدس سرزمین کی طرف دیکھنے کا خیال تک نہیں کر سکیں گے کیونکہ انہیں بخوبی علم ہو گا کہ اگر انہوں نے پاکستان کی طرف قدم بڑھایا تو (انشاء اللہ) انہیں ویت نام میں امریکہ کی شکست سے زیادہ شرمناک ہزیمت و پسپائی کا سامنا کرنا ہو گا۔ ہمیں ایٹمی ہتھیاروں سے ذرا بھی خائف ہونے کی ضرورت نہیں۔ جس وقت بھی ایک فریق نے دوسرے کے خلاف ایٹمی ہتھیار استعمال کئے، دوسرا فریق بھی اپنے دفاع کے لئے ایٹمی ہتھیاروں کے استعمال سے دریغ نہیں کرے گا۔ اس ناگزیر طریقۂ کار کو مختصراً بیان کرنا مشکل ہے تاہم یہ حقیقت ہے کہ ایٹمی ہتھیار جدید دور کی سیاست میں ایک کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ مسٹر نکسن نے ایشیائی امور کے بارے میں اپنی تقاریر میں ایشیائی اقوام کو تحفظ کی جو ضمانت دی ہے، وہ یاد رکھنے کی بات ہے۔ اُن کے سامنے اس کے سوا کوئی متبادل نہیں کہ ایشیائی اقوام کو ایٹمی ہتھیاروں سے محفوظ رکھنے

کی ضمانت دیں کیونکہ جس دن بھی کسی ملک نے ایٹمی ہتھیار استعمال کیے وہ دن شاید ہماری دُنیا اور بنی نوع انسان کے لیے آخری دن ہوگا۔

یہ ایک افسوسناک امر ہے کہ مملکتِ خداداد اسلام کے خلاف بغاوت کے مترادف ہے کہ پاکستان کے مسلمانوں کو مناسب فوجی تربیت سے محروم رکھا گیا ہے جبکہ سوئٹزرلینڈ جیسے چھوٹے سے ملک میں پوری قوم وطن کی حفاظت کے لیے رضا کار فوج کی طرح ہر وقت تیار ہے یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ روس، امریکہ، فرانس اور برطانیہ نے سوئٹزرلینڈ کے دفاع کی ضمانت دی ہے۔

پاکستان کی گزشتہ حکومتیں خصوصاً ایوب خاں کی حکومت کی یہ کوشش رہی ہے کہ عوام کو فوجی تربیت نہ دی جائے اور اس کے جو اسباب تھے اُن سے ہر شخص بخوبی واقف ہے ایوب خاں نے جو بزعم خود "پاکستان کے نجات دہندہ" تھے اس بات کی پوری پوری کوشش کی کہ پاکستانی باشندے فوجی تربیت حاصل نہ کر سکیں، اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم سے چار گنا طاقتور ملک خدا نہ کرے اگر پاکستان کے علاقے میں اندر تک داخل ہو جائے تو اسپین کی طرح پاکستان کے لاکھوں باشندے بھی بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کر دیئے جائیں گے اور ہماری مائیں اور بہنیں برسرِ بازار رسوا ہوں گی۔

خود ہندوستان کے بے سہارا مسلمانوں کو اقتصادی اعتبار سے کچلا جا رہا ہے اور انہیں روزگار کے مواقع حاصل نہیں ہیں۔ ہر روز ہندوستان کے بے گناہ مسلمانوں پر ناقابلِ بیان ظلم و ستم کے پہاڑ ٹوٹتے ہیں۔ وہاں مسلم کش فسادات روزانہ کا معمول بن چکے ہیں اور مسلمان مردوں، عورتوں اور بچوں کو بہیمانہ طریقے سے قتل کیا جا رہا ہے۔ علاوہ ازیں روس اور امریکہ دونوں ملکوں سے ہندوستان کو جدید ترین ہتھیار اور دوسرے ساز و سامان کی لگاتار امداد مل رہی ہے ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد سے ہندوستان کی فوجی طاقت تقریباً دگنی ہو گئی ہے۔ ہندوستان کو اتنی بڑی تعداد میں جنگی جہاز اور آبدوزیں مل رہی ہیں کہ آج وہ مشرق بعید میں سب سے بڑی بحری قوت

بن گیا ہے۔ ان حالات میں کیا کوئی حکومت تشویشناک صورتِ حال کی طرف سے غافل ہوکر یقین کر سکتی ہے کہ صرف مسلح افواج صورتِ حال سے نمٹنے کے لئے کافی ہیں؟ اس وقت ہمیں اپنے حالات کا جائزہ لینا چاہئے۔ ہمارے دانشمند لیڈر کیا سوچ رہے ہیں اور کس بات کا انتظار کر رہے ہیں؟ کیا ہم بالکل غافل اور ناعاقبت اندیش ہو گئے ہیں؟ کیا ہم "نوشتۂ دیوار" پڑھنے سے بھی معذور ہیں؟ کیا اس کا سبب یہ ہے کہ خدا نے ہماری بداعمالیوں کے سبب ہم سے فہم و فراست چھین لی ہے یا ہم نے خود طبقہ واریت اور علاقائی تعصب و عداوت کے سبب ایسے لوگوں کو رہنما بنا کر خود پر مسلط کر لیا ہے جنہیں ذاتی مفاد کے سوا کوئی چیز عزیز نہیں۔ اب بھی وقت ہے کہ عوام بالخصوص دانشور اور ذمہ دار پاکستانی شہری تمام باتوں پر سنجیدگی سے غور کریں۔ روز بروز خطرہ ہم سے قریب ہوتا جا رہا ہے۔

ہتھیاروں کے غلط استعمال کی روک تھام کے لئے ہر مسلمان باشندے سے قرآن پاک اور دیگر مذاہب کے پیروؤں سے اُن کی مذہبی کتابوں پر یہ حلف لیا جا سکتا ہے کہ وہ ان ہتھیاروں کو اپنے ہم وطن بھائیوں کے خلاف استعمال نہیں کریں گے بلکہ صرف وطن کے دفاع کے لئے ہتھیار اُٹھائیں گے۔ اس حلف کے بعد ہر پاکستانی شہری کو مناسب تربیت کے بعد ہتھیار دیئے جائیں۔ خواتین کو شہری دفاع کے تمام شعبوں کی تربیت دی جائے جس طرح سوئٹزرلینڈ میں کیا گیا ہے۔ اگر کوئی شخص اس حلف کا احترام نہ کرے اور ہتھیاروں سے کسی شخص کو نقصان پہنچائے تو اسے سخت ترین سزا (جس میں سزائے موت بھی شامل ہے) دی جائے۔ اس طرح ہتھیاروں کے غلط استعمال کو روکا جا سکے گا۔

اگلے انتخابات میں جو سیاسی جماعت یا اُمیدوار اس بات کا وعدہ نہ کرے کہ پاکستان کے ہر شہری کو لازمی فوجی تربیت دی جائے گی اُسے ووٹ نہ دیا جائے۔ مُلک کا دفاع تمام چیزوں پر مقدم ہے۔ دفاع کا مطلب یہ ہے کہ پاکستان کا ہر مسلمان شہری پاکستان کی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کرے۔ جہاں تک غیر مسلم شہریوں کا تعلق ہے وہ تحفظ چاہتے ہیں

اور ہمیں فخر ہے کہ ہمارے وطن میں اقلیتیں بالکل محفوظ ہیں اور خوشحال زندگی گزار رہی ہیں۔ دُنیا کے کسی بھی خطے سے تعلق رکھنے والا کوئی بھی شخص اس کا مشاہدہ کر سکتا ہے۔ حقیقت میں ہماری حکومت کو کسی بین الاقوامی ادارے یا کمیٹی کو تحقیقاتی مشن پر آنے اور یہ معلوم کرنے کی دعوت دینی چاہئے کہ آیا پاکستان میں ۱۹۴۷ء کے بعد سے کوئی فرقہ وارانہ فساد ہوا ہے؟ مجھے ایسا ایک قابل ذکر واقعہ بھی یاد نہیں ہے جب پچھلے بیس برس میں پاکستان میں کوئی فرقہ وارانہ فساد ہوا ہو جبکہ اس کے برعکس ہندوستان میں مسلم کش فسادات روزمرہ کا معمول بن چکے ہیں۔

ہماری گزشتہ حکومتیں خصوصاً پچھلی حکومت صرف لوگوں کو بیوقوف بنانے میں مصروف تھی۔ اس حکومت نے خوبصورت و دلکش لڑکیوں کو ریڈ کراس کلب کا رکن بننے کی اجازت دی اور نوجوان مردوں کو عیاشی اور عیش طلبی کے راستے پر ڈال دیا۔ لوگوں کو "ڈنڈا" تک استعمال کرنے کی تربیت نہیں دی گئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے عقل مند دور میں حکمران خوبصورت عورتوں کی ایک فوج تیار کر رہے تھے جو اپنے حسن کے جادو اور بیلی ڈانس سے دشمن کا مقابلہ کرتی۔ یہ تماشا اب ختم ہو جانا چاہئے کیونکہ نہ صرف یہ ہمارے قومی اور مذہبی وقار کے منافی ہے بلکہ یہ لوگوں کے ساتھ ایک کھلا ہوا اور بھونڈا مذاق ہے۔

عوام کو فوجی تربیت دے کر ہم لاکھوں جوانوں پر مشتمل جو فوج تیار کریں گے اس میں سے کم از کم پانچ لاکھ جوانوں کو چھاپہ مار جنگ کی تربیت دی جائے۔ اگر ایسا ہو گیا تو پاکستان مشرق بعید میں عظیم ترین فوجی قوت بن جائے گا کیونکہ جب مسلمان خدا کی راہ میں جہاد کرتا ہے تو ایک مسلمان سپاہی دشمن کے کم از کم چار سپاہیوں کے برابر ہوتا ہے۔ خود مسلمانوں کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے۔ ہندوستان یہ سوچنے پر مجبور ہو گا کہ اپنی تمام تر فوجی قوت کے باوجود وہ پاکستان پر حملہ تو در کنار پاکستان کی سلامتی کے خلاف ایک بھی قدم نہیں اٹھا سکے گا اور اس طرح وہ پاکستان کے ساتھ کشمیر کے مسئلے کے تصفیہ پر مجبور ہو جائے گا۔ اس وقت روس اور امریکہ بھی ہندوستان پر صحیح طور پر دباؤ ڈال سکیں گے کہ وہ پاکستان کے ساتھ کشمیر کا جھگڑا طے کرے۔ علاوہ ازیں

دُنیا کے تمام مُلک ہماری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائیں گے کیونکہ موجودہ زمانے کی بین الاقوامی سیاست میں صرف طاقتور قوموں ہی کے دوست ہوا کرتے ہیں۔

جب تک ہم اپنے حقوق حاصل کرنے کی قوت نہیں رکھتے امن وامان قائم ہونا دشوار ہے۔ روس اور امریکہ میں لڑائی نہ ہونے کا سبب یہ ہے کہ دونوں طاقتور مُلک ہیں۔ ان میں سے ایک مُلک بھی اگر کمزور ہوتا تو عالمی جنگ عرصہ پہلے چھڑ گئی ہوتی۔ ریزرو فوج بنا کر ہمیں بہت سے فائدے ہوں گے۔ اس سے علاقے میں امن قائم ہو جائے گا۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ حقیقی امن ہی کی صورت میں ہم خوشحال قوم بن سکتے ہیں۔ اگر ہم نے عوام کو لازمی فوجی تربیت دے کر ریزرو فوج تیار کر لی تو صرف اسی سے ہمارے بیشتر مسائل یعنی ۲۰ فیصد مسئلے حل ہو جائیں گے۔

باب ہفتم

تعمیر مکانات میں انقلاب

ہر شخص کو بنیادی طور پر سر چھپانے کی ضرورت ہے۔ ہر پاکستانی باشندے کو یہ حق حاصل ہے کہ اس کے پاس مکان ہو۔ قومی ترقی کے پروگرام میں ہمارا مقصد بلند و بالا عمارتوں کی تعمیر نہ ہونا چاہیئے بلکہ ایسے چھوٹے چھوٹے مکانات کی تعمیر ہونا چاہیے جو پاکستان کے لاکھوں باشندوں کی ضرورت پوری کر سکیں۔ ہمارے پاس خدا کے فضل سے زمین کی کمی نہیں ہے اس لئے ہم بآسانی چھوٹے مکانات بنا سکتے ہیں۔ ہمارا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ "ہر خاندان کو مکان فراہم کیا جائے" اور یہ مکانات اسلامی معاشرے کی روایات کے مطابق ہونے چاہئیں۔

۱۲ × ۱۰ کے دو کمروں اور ۲۴ × ۸ کے برآمدے پر مشتمل ایک منزلہ مکان کے لئے زیادہ فولاد کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف سیمنٹ ایک ایسی چیز ہے جو بلاک بنانے، چھت ڈالنے اور پلاستر کے لئے درکار ہوگا اور در اصل مکان کی تعمیر میں سب سے بڑی رکاوٹ سیمنٹ کی قیمت ہے۔

سیمنٹ نہ صرف بغیر ٹیکس کے بلکہ رعایتی داموں پر مہیا کیا جائے تاکہ غریب افراد بھی اپنے محدود وسائل کے ساتھ سر چھپانے کی جگہ حاصل کر سکیں۔ رعایتی داموں پر سیمنٹ کی فراہمی سے ایک چھوٹے مکان پر ۲۵۰۰ روپے سے زیادہ لاگت نہیں آئے گی۔ حکومت یا منظور شدہ سرکاری ادارے بیس پچیس روپے ماہانہ کی قسطوں پر بھی نادار عوام کو مکانات فراہم کر سکتے ہیں۔ خریدار کی حیثیت کے مطابق ماہانہ قسطوں کی رقم طے کی جا سکتی ہے۔

اس مقصد کے لئے سب سے پہلے حکومت کو تعمیراتی سامان خصوصاً سیمنٹ پر ٹیکس ختم کرنا ہوگا۔ حکومت دوسرے ذرائع سے پہلے ہی کافی ٹیکس وصول کر لیتی ہے۔ تعمیراتی

سامان خصوصاً سیمنٹ پر ٹیکس، موجودہ حالات میں جبکہ لوگوں کو کم لاگت کے مکانات مہیا نہیں کئے جا سکتے، ناجائز اور غیر ضروری ہے۔

خوراک، کپڑا اور مکان ہر انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ اناج، تعمیراتی سامان خصوصاً سیمنٹ اور معمولی کپڑے پر ٹیکس لگانے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو بنیادی ضرورت سے محروم کیا جا رہا ہے۔ حقیقت میں عوام کو اگلے انتخابات میں حصہ لینے والی سیاسی جماعتوں سے اس بات کی ضمانت حاصل کر لینی چاہئے کہ وہ کھانے پینے کی چیزوں، سیمنٹ اور معمولی کپڑے پر جس میں دستی کرگھے پر تیار ہونے والا کپڑا بھی شامل ہے کوئی ٹیکس نہیں لگائیں گی۔

ہمارے ملک میں حکومت ہر طریقے سے ہر چیز پر ٹیکس لگاتی ہے لیکن اس کے بدلے عوام کو کوئی سہولت میسر نہیں ہوتی۔ مغربی یورپ کے ملکوں میں، جہاں بھاری ٹیکس لگائے جاتے ہیں، حکومت صحت کی قومی اسکیم، بے روزگاری کے خلاف تحفظ، ضعیفی میں پنشن، مفت تعلیم، سرکاری اور بلدیاتی یتیم خانے اور حکومت کی طرف سے کم لاگت کے مکانات جیسی سہولتیں مہیا کرتی ہے۔ اس کے علاوہ سماجی بھلائی کی بے شمار اسکیموں سے بھی عوام کو فائدہ پہنچتا ہے۔

کم و بیش ہر پاکستانی باشندہ اس بات سے بخوبی واقف ہے کہ قومی دولت کا بیشتر حصہ مختلف سرکاری محکموں کے افسروں اور اُن کے خاندانوں کے لئے پُرتکلف بنگلے اور دوسرے تعیشات پر خرچ ہو جاتا ہے۔ نوکر شاہی نے اس ملک کو ہر ممکن طریقے سے لوٹا ہے۔ ناقص سرکاری عمارتیں، سڑکیں اور پُل اور گندے پانی اور آب رسانی کی ناقص پائپ لائنیں وغیرہ اس نااہلی اور بدعنوانی کی مثال ہیں۔

یہ نااہل، بدعنوان اور مفاد پرست افراد برسرِ اقتدار آنے کے بعد سرکاری محکموں سے رشوت جیسی لعنت ختم کرنے اور ملک کو اس زبردست مالی نقصان سے بچانے کے بارے میں بھلا کیا سوچ سکتے ہیں۔ اس کے برعکس جب حالات خراب ہونے لگتے ہیں تو یہ لوگ مائیں بازو کی انتہا پسند جماعتوں کا تعاون حاصل کرنے اور لوگوں کو اجتماعیت اور قومیت کے کھوکھلے نعروں سے

بہلانے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

ان شرمناک حرکتوں کا مقصد حالات کو اور زیادہ پیچیدہ بنانے کے سوا کچھ نہیں۔ میں تجویز پیش کروں گا کہ ہماری حکومت لوگوں کو بیوقوف بنانے کے بجائے انہیں مکان مہیا کرنے یا مکانات کی تعمیر کے لئے امداد فراہم کرنے کی تدبیریں کرے۔ حکومت کو نہ صرف سیمنٹ اور دوسرے تعمیراتی سامان پر ٹیکسوں کی چھوٹ دے دینی چاہئے بلکہ کم لاگت کے مکانوں کی اسکیموں کے لئے سیمنٹ رعایتی داموں مہیا کرنا چاہئے۔ یہ اسکیمیں ٹیکس ادا نہ کرنے والے غریب باشندوں یا کم آمدنی والے افراد کے لئے تیار کی جائیں۔

اگر سیمنٹ کی موجودہ پیداوار سے اس سہولت کے بعد مانگ پوری نہ کی جاسکے تو سیمنٹ کے کارخانوں میں توسیع کی جائے یا نئے کارخانے قائم کئے جائیں۔ مکان کی تعمیر کے عام سہولتیں خصوصاً غریب اور کم آمدنی والے لوگوں کے لئے رعایتی داموں سیمنٹ فراہم کرنے سے وہ اپنے خاندان کے لئے سر چھپانے کی جگہ حاصل کر سکیں گے اور یوں ہمارے گیارہ فیصد قومی مسائل حل ہو جائیں گے۔

باب ہشتم

بدعنوانیوں کے خلاف جہاد ـــ سماجی انقلاب

اس باب میں میں قومی زندگی کے ایک اور اہم شعبے پر روشنی ڈالوں گا۔ بدعنوانی کی کئی صورتیں ہیں اور اس سے ہمارے وجود کی بنیادیں کمزور ہوتی جا رہی ہیں۔ اس سے ہماری معیشت کو زبردست نقصان پہنچا ہے اور اب قومی سلامتی کا تقاضا ہے کہ معاشرے سے اس ناسور کو نکال باہر کیا جائے۔ میں بدعنوانی کے زیادہ اہم پہلوؤں کا ذکر کروں گا۔

اسمگلنگ

اسمگلنگ ہمارے ملک کے لئے انتہائی شرمناک بات ہے اور ہم ابھی تک اس برائی کو ختم کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے ہیں۔ اس کے بجائے اسمگلنگ میں زبردست اضافہ ہوگیا ہے اور اب اس نے ایک ''بین الاقوامی تجارت'' کا روپ اختیار کرلیا ہے۔ دنیا کا کوئی ملک اسمگلنگ برداشت نہیں کرسکتا کیونکہ اس سے ملکی معیشت دیکھتے دیکھتے تباہ ہو جاتی ہے۔

یورپ میں سوئٹزرلینڈ، چیکوسلاویکیہ، ہنگری، جرمنی، رومانیہ اور پولینڈ آس پاس بہت سے ملکوں سے گھرے ہوئے ہیں۔ سوئٹزرلینڈ کی سرحدیں جرمنی، فرانس، اٹلی اور آسٹریلیا سے ملی ہوئی ہیں لیکن وہاں برسہا برس سے منظم طور پر اسمگلنگ کا ایک بھی واقعہ نہیں ہوا۔ مقامی حکام اور اعلیٰ سرکاری افسروں کو ملائے بغیر منظم طور پر اسمگلنگ ممکن ہی نہیں ہے۔

پاکستان میں اسمگلنگ انتہائی منظم طریقے پر ہوتی ہے۔ موٹر لانچوں اور اسٹیمروں

کے علاوہ ٹرک اور اونٹوں کے قافلے مال ناجائز طور پر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچاتے ہیں۔ ہمیں اناج کی سخت ضرورت ہے مگر یہ اناج بھاری مقدار میں سرحد کے اُس پار پہنچا دیا جاتا ہے۔ دوا (جو درآمد کی جاتی ہے) جیسی ضروری چیز اور شکر سرحد کے اُس پار بھیج دی جاتی ہے جس سے مُلک میں ان چیزوں کی شدید قلّت ہو جاتی ہے۔ درحقیقت ۱۹۶۸-۶۹ء کے دوران پاکستان میں شکر کی قلّت نہ تھی لیکن بڑے پیمانے پر اسمگلنگ سے مُلک میں شکر کی سخت قلّت ہو گئی اور ہمیں باہر سے لاکھوں رُوپے کی شکر درآمد کرنی پڑی۔ ملکی معیشت کو تباہ کرنے والا یہ کاروبار مُلک کے دونوں صوبوں میں پورے زور شور سے جاری ہے۔ پاکستانی کپڑا کلکتہ اور ہندوستان کے دوسرے شہروں میں کھُلے بندوں فروخت ہو رہا ہے۔ پاکستان سے خام پٹ سن ہندوستان بھیج دیا جاتا ہے اور ہندوستانی کارخانوں میں ہزاروں ٹن پاکستانی پٹ سن سے دوسری مصنوعات تیار ہوتی ہیں۔

مغربی پاکستان میں لنڈی کوتل، کوئٹہ اور سندھ کے ریگستان میں چند مقامات اس سلسلے میں خاصے بدنام ہیں۔ جہاں رات دن بڑے پیمانے پر مال اِدھر سے اُدھر پہنچا دیا جاتا ہے۔ اس ناجائز تجارت کے بارے میں مکمّل اور دُرست اطلاعات کے باوجود اس کی روک تھام کی اب تک کوئی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ کم سے کم وسیلے رکھنے والی حکومت بھی سمگلنگ پر بخوبی قابو پا سکتی ہے۔ ضرورت صرف خلوص اور فرض شناسی کے جذبے کی ہے۔ چند چھوٹے ہوائی جہازوں میں مشین گنیں نصب کر کے اور مسلّح گشتی دستوں کے ذریعے سمگلنگ کی لعنت کو ہمیشہ کے لئے ختم کیا جا سکتا ہے۔ حکومت کے لئے یہ معلوم کرنا بھی چنداں دشوار نہیں ہے کہ کون کون سے سرکاری افسر اور دیگر شخصیات ایسے گھناؤنے کاروبار کی پُشت پناہی کر رہی ہیں۔ اسمگلروں کے ساتھ ساتھ ان لوگوں پر بھی مقدمات چلائے جائیں اور ضروری ہو تو بر سرِ عام پھانسی دے دی جائے۔ صرف اسمگلنگ پر قابو پا کر ہم کم از کم ۵ ٪ قومی مسائل حل ہو سکتے ہیں۔

رشوت اور بدعنوانی

پاکستان کو جن باتوں اور خرابیوں سے اندرونی طور پر زبردست نقصان پہنچ رہا ہے، ان میں رشوت ستانی اور بدعنوانی کا معاملہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یہ ایک ایسی خرابی ہے کہ اگر شروع ہی میں اس کو ختم نہ کر دیا جائے تو قومی زندگی کے ہر شعبے میں اس کا زہر سرایت کر جاتا ہے، حتیٰ کہ جسد سیاست کے "خاص سرچشمے" بھی زہر آلود ہونے سے محفوظ نہیں رہتے۔ جب تک قومی زندگی کو اس گندے ناسور سے پاک نہیں کیا جاتا تمام ترقی اور خوش حالی بے معنی ہے۔ معاشرے کی دوسری خرابیوں مثلاً شراب نوشی، قماربازی، بداخلاقی، نااہلیت وغیرہ میں رشوت اور بدعنوانی غالباً سب سے زیادہ نقصان دہ ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ذرا سی نرمی بھی اس سماجی برائی کو ختم کرنے کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔ اس کا علاج صرف یہ ہے کہ یا تو رشوت ستانی اور بدعنوانی کا سرے سے خاتمہ کر دیا جائے یا معاشرے اور معیشت کی تباہی کے لئے تیار رہنا چاہئے۔

پاکستان میں رشوت نے وبا کی شکل اختیار کر لی ہے اور قومی زندگی کا کوئی شعبہ اس سے محفوظ نہیں رہا ہے۔ پاکستان سے رشوت کا خاتمہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لئے ہر مرحلے پر طویل اور مختصر مدت کے خصوصی اقدامات کی ضرورت ہے۔ ہر شعبے کے ماہرین کو اس خرابی کو دُور کرنے کے لئے مسلسل جدوجہد کرنی ہوگی۔ اس سلسلے میں قومی مقاصد کے حصول کو باعث عزت و افتخار سمجھنا، وطن دوستی کے جذبے کو اُبھارنا، عوام کو ذہنی طور پر اس خرابی کے خلاف جدوجہد کے لئے تیار کرنا اور معاشرے کے ہر فرد اور طبقے کو اس قابل نفرت بُرائی کے اثرات سے باخبر کرنا ضروری ہے۔ اس قومی بیداری کے لئے ابتدائی تعلیم سے یونیورسٹی کی سطح تک ہر مرحلے پر اسلام کے اخلاقی اصُولوں اور اقدار کا احیاء لازمی حیثیت رکھتا ہے۔

رشوت کے خاتمے کے لئے فحش کتابوں، رسائل اور فلموں اور جنس کو اشتہار بازی کا ذریعہ بنانے والے اخباروں اور رسالوں پر مکمل پابندی، شراب نوشی، قماربازی اور دوسری

خرابیوں کے خلاف بڑے پیمانے پر مہم کے ذریعہ عوام میں بیداری پیدا کرنی اور سخت اقدامات کرنے ضروری ہیں۔ اس خرابی کو ختم کرنے کے لیے اُن ذریعوں کو ختم کرنا ہو گا جن سے رشوت لینے اور دینے کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ جو لوگ رشوت لینے اور دینے کے مرتکب پائے جائیں، اُنہیں عبرتناک سزا ملنی چاہیے۔ کسی قوم کی اخلاقی زندگی کے لئے اس سے زیادہ خطرناک کوئی دوسری بات نہیں ہے کہ برائیوں اور خرابیوں کو برداشت کر لیا جائے۔

رشوت، جنگل کی آگ کی طرح تیزی سے پھیلتی ہے اور ایک ایسے معاشرے میں جہاں زندگی کی اچھی اور مثبت اقدار ترک کر دی جائیں اور بغض، تعصب، نفرت و ناانصافی کا دور دورہ ہو، نہایت گہری جڑیں پکڑ لیتی ہے۔

ان تمام باتوں کے علاوہ ہم سب کا اوّلین مقصد یہ ہو چاہئے کہ لوگوں کے دلوں میں خدا کا خوف اور اپنے اعمال کے مواخذے کا احساس پیدا کریں۔ اُنہیں یہ سمجھنا چاہیے کہ کوئی نیکی رائیگاں نہیں جاتی اور اس کا صلہ ضرور ملتا ہے۔ جس طرح بُرائی کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ قرآن مجید میں ہمیں اس حقیقت کی جانب توجہ دلائی گئی ہے اور خبردار کیا گیا ہے کہ قیامت کے روز ہمیں داورِ محشر کے سامنے اپنے اعمال کی جوابدہی کرنی ہو گی۔ اس کا اطلاق نہ صرف فرد پر بلکہ اقوام پر بھی ہو گا۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:-

> "اور اعمال نامے تمہارے (سامنے لائے) جائیں گے اور تم دیکھو گے کہ گنہگار بہت خوفزدہ ہیں اس (اعمال نامہ) کا خیال کر کے۔ وہ کہیں گے "حیرت ہے۔ یہ کیا کتاب ہے! اس میں تو کوئی بڑی اور کوئی چھوٹی بات چھوڑی ہی نہیں گئی۔ یہ تو ہر چیز کا حساب مانگ رہی ہے"۔ انہوں نے جو کچھ کیا اس میں (درج شدہ) مل جائے گا وہ ان کے سامنے لائے جائینگے اور خدا کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں کرتا ہے (القرآن۔ پارہ ۱۳)

قیامت کے روز ہمارے اعمال ہمارے سامنے ہوں گے اور اعمال کے حساب

ہم سزا اور جزا کے مستحق ہوں گے۔

اس دُنیا میں دوسروں پر ظلم کرنے اور انہیں نقصان پہنچانے کی اُسی صورت میں میں سزا ملتی ہے جب مجرم گرفت میں آجائے۔ لہٰذا ایسے بہت سے لوگ جو بُرائیوں میں آلودہ ہیں اور کسی نہ کسی صورت میں دوسروں کو نقصان پہنچا رہے ہیں، سزا سے بچے ہوئے ہیں مگر قیامت کے دن یہ ممکن نہ ہوگا۔ ہر شخص کو اس کے اعمال کا صلہ یا سزا ملے گی۔ معاشرے کی اخلاقی بُنیادیں کمزور کرنے اور اپنی شرانگیزی سے لاکھوں افراد اور آئندہ نسلوں کی زندگی برباد کرنے جیسے سنگین جرائم کی سزا انتہائی سخت اور عبرت انگیز ہونی چاہیے۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ مجرم اپنی ہوشیاری اور چالاکی سے اگر اس دُنیا میں سزا سے بچ بھی گیا تو خدا کے سامنے اسے اپنے اعمال کی یقیناً جوابدہی کرنی ہوگی اور عذاب بھگتنا ہوگا۔

پاکستان میں پچھلے بائیس برس سے برسرِ اقتدار رہنے والے افراد کو مالک حقیقی کے روبرو پیش ہونا اور اپنے اعمال کی سزا بھگتنا ہوگی۔

ہماری پچھلی حکومتوں کی طرف سے اسلام کی درخشاں اقدار کی جانب سے لاپروائی برتنے انکی خلاف ورزی کرنے اور پاکستان کے قیام کے مقاصد کے منافی سرگرمیوں کے نتیجے میں رشوت کی جڑیں ہمارے معاشرے میں خاصی مضبوط ہو گئی ہیں۔ یہ بھی سابقہ حکومتوں کی بداعمالیوں میں شامل ہے کہ انہوں نے پاکستان کے قومی مسائل کو حل کرنے کے لئے "غیر دیانتدارانہ" طریقے اختیار کئے۔ انہوں نے ہر وہ کام کیا جو انہیں نہیں کرنا چاہیے تھا اور اپنے فرائض اور ذمہ داریوں سے ہمیشہ پہلوتہی کی۔ سابقہ حکومتیں، عوام کے سامنے پاکستان کے قیام کے حقیقی مقاصد پیش نہ کرنے اور انہیں قیامِ پاکستان کے حقیقی معنی سے روشناس نہ کرانے کی بھی مجرم ہیں۔

یہ کتنی افسوسناک اور تلخ حقیقت ہے کہ "اسلامی مملکت پاکستان" کی نام نہاد حکومتوں نے اپنی سرگرمیوں سے ہمیشہ مذہب خصوصاً اسلام کا مضحکہ اڑایا ہے۔ انہوں نے اسلامی اقدار کو نظرانداز کر کے مغربی اقدار کو اپنایا اور اس کے نتیجے میں ایک ایسی نوجوان نسل ہمارے سامنے ہے

جو اپنے راستے سے بھٹک چکی ہے۔ انہوں نے ہمارے محنت سے کمائے ہوئے زرِ مبادلہ کے بدلے فحش کتب و رسائل درآمد کر کے ملک میں بداخلاقی کا راستہ کھول دیا۔ آج بھی ملک کے گوشے گوشے میں کتابوں کی دکانوں پر یہ مخرب اخلاق لٹریچر موجود ہے۔ ہمارے ملک میں شام کے بیشتر اخبار خصوصاً جنس کے سہارے زندہ ہیں اور یہ سب کچھ "آزادیٔ صحافت" کے نام پر ہو رہا ہے۔ جنس زدہ یورپ کے کسی گوشے میں جنسی بے راہ روی کا کوئی واقعہ ایسا نہیں جس کی تصاویر و تفصیلات ان اخباروں میں شائع نہ ہوتی ہوں۔ ہمارے معاشرے کے ان درندہ صفت مجرموں کو آزادیٔ اظہار کا ہیرو سمجھا جاتا ہے۔

قرآن پاک میں ایسے لوگوں ہی کے لئے کہا گیا ہے:۔

ان دلوں کو بیماری لگ گئی ہے اور اللہ ان کی بیماری کو بڑھاتا ہے۔ ان کے لئے دردناک عذاب ہے کیونکہ وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ کیونکہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین پر فساد نہ پھیلاؤ تو وہ کہتے ہیں ہم امن پھیلانے والے ہیں۔ کیا بے شک وہ شر پھیلانے والے نہیں ہیں؟ لیکن وہ (اس بات کو) قبول نہیں کرتے۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس طرح ایمان لاؤ جیسے لوگ ایمان لائے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: کیا ہم اس طرح ایمان لائیں جس طرح بے وقوف ایمان لاتے ہیں۔

کیا حقیقت میں وہی بے وقوف نہیں ہیں؟ لیکن وہ نہیں جانتے۔

(القرآن، دوم، ۱۰)

جب تک ہم اپنی قومی زندگی سنوارنے، خدا کا خوف پیدا کرنے، قومی زندگی میں اپنی انفرادی ذمہ داریاں بحسن و خوبی انجام دینے اور پاکستانی باشندوں کے سوچنے کے انداز کو یکسر بدل دینے کی غرض سے عوام میں ایک نیا جذبہ پیدا کرنے کی پختہ اور ٹھوس کوشش نہیں کریں گے، رشوت کی روک تھام کے تمام طریقے ناپائیدار ثابت ہوں گے۔

باب نہم

سُود کی لعنت

پچھلے صفحات میں ہم فوری اہمیت کے چند حل طلب قومی مسائل کا ذکر کر چکے ہیں جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے ان مسئلوں کا تعلق ہمارے معاشرہ کے سماجی واقتصادی نظام سے ہے اس نظام میں رَدّ و بدل کی کئی کوششیں کی گئی ہیں اور آج اپنی بُنیادی خرابیوں کے ساتھ یہ نظام ہمارے سامنے ہے۔ اُمید ہے کہ ہماری تجویز کردہ اصلاحات کے نتیجے میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایک ایسا طریقۂ کار وجود میں آجائے گا جس سے ہمارے سماجی واقتصادی نظام کی بیشتر خرابیاں دُور ہو جائیں گی اور چند بُنیادی سقم دُور ہو سکیں گے۔

تاہم ہم جس مکمل انقلاب کی کوشش کر رہے ہیں وہ اس وقت تک بروئے کار نہیں آسکے گا جب تک معیشت اور معاشرے میں چند بُنیادی تبدیلیاں نہ کی جائیں۔ ہم نے گزشتہ صفحات میں جس اخلاقی اور تعلیمی انقلاب کا تذکرہ کیا ہے اُس کے بعد کچھ تبدیلیاں خود بخود واقع ہو جائیں گی اور ایک صحیح قیادت کے اُبھرنے کے بعد جو قومی مسائل کو خلوص دیانتداری صبر و تحمل اور پختہ یقین کے ساتھ حل کرنے کی کوشش کرے گی، اس نظام کی چند دوسری خرابیاں بھی دُور ہو جائیں گی۔ ہم نے قومی مسائل کے مختصر المیعاد اور طویل المیعاد مسائل کی مکمل فہرست تو پیش نہیں کی ہے تاہم اس امر کی کوشش کی ہے کہ ان مسائل کی نوعیت پر روشنی ڈالیں اور اُن اہم شعبوں پر غور کریں جن میں اصلاح کی ضرورت ہے۔ ہم نے انتہائی وضاحت کے ساتھ اُن خطوط کی نشاندہی بھی کی ہے جن پر قومی مسائل کو حل کیا جا سکتا ہے۔ ہماری توجہ اس بات پر رہی ہے کہ مسائل کو حل کرنے کے لئے نئے اندازِ فکر اور نئے طریقہ کار کی ضرورت ہے،

اور اس سلسلے میں ہم نے مختلف مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ توقع ہے کہ ہمارا نقطۂ نظر اب بخوبی واضح ہو چکا ہے۔

جیسا کہ ہم پیش لفظ میں کہہ چکے ہیں اس نئے اندازِ فکر سے نہ صرف ہم اپنے فوری مسائل کو حل کر سکیں گے بلکہ اس سے ایک مکمل اور دائمی انقلاب کا راستہ بھی ہموار ہو جائیگا اور ہماری قومی زندگی بلکہ پوری اُمت کے لئے ایک نئے دَور کا آغاز ممکن ہو سکے گا۔

طویل المیعاد مسائل کا جائزہ لیتے ہوئے اس بات پر خاصا تعجب ہوتا ہے کہ اسلام نے سود اور بغیر سودی معیشت کے قیام کی غرض سے بُنیادی تبدیلیوں کے سلسلے میں کتنے واضح احکامات دیئے ہیں۔ ہم مثالوں کے ذریعے اس مسئلے پر مزید غور کرتے ہیں۔ اگر ہم خلوص دل سے اللہ کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے کے خواہاں ہیں تو کوئی دشواری ایسی نہیں جس پر ہم قابو نہ پا سکیں اور ہماری راہ کی کوئی رکاوٹ ہمارا راستہ نہیں روک سکتی۔ بناء بریں میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ان صفحات میں پیش کی ہوئی نئی حکمتِ عملی سے ہمارے قومی مسائل حل کئے جا سکتے ہیں۔ خواہ یہ مسائل مختصر المیعاد ہوں یا طویل المیعاد۔ اپنے نقطۂ نظر کی مزید وضاحت کے لئے ہم سود کے مسئلے پر بحث کریں گے۔

سود کا مسئلہ ایک مہیب و خوفناک مسئلہ ہے۔ خوفناک اس طرح کہ پوری معیشت کی بُنیاد سود پر ہے خواہ ہم اس کا اندازہ لگائیں یا نہ لگائیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ سود، ہمارے بیشتر اقتصادی اور سماجی مسائل کا اصل سبب ہے۔* یہ ہمارے لئے ایک چیلنج کی حیثیت

---

* ہماری آنکھ سے بہت سی چیزیں پوشیدہ رہتی ہیں کیونکہ اوّل تو ہم ان چیزوں کو ایک مخصوص زاویہ نظر سے دیکھتے ہیں دوئم یہ کہ اپنی بساط برابر انہیں سمجھنے بوجھنے کی کوششیں کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر جسے ہم پانی کہتے ہیں وہ سائنسداں کے نزدیک H_2O ہے۔ سطحی انداز میں دیکھنے والے کو یہ ایک سادہ سا مائع نظر آئے گا مگر دقیق نظر کے ساتھ اور اسرار و معنی کی گہرائیوں میں ڈوبنے والے کیلئے یہ ہائیڈروجن اور آکسیجن گیس کا ایک مرکب ہے۔ یہی حال سماجی اور اقتصادی مسائل کے حل کا ہے۔ مسائل کی تشکیل کرنے والے کئی اسباب عام لوگوں کی نظر سے اوجھل رہتے ہیں اور سود بھی ان میں سے ایک اہم اور مہیب عنصر ہے۔

رکھتا ہے کیونکہ آج پوری دُنیا کی معیشت کی بنیاد سود پر ہے اور جو لوگ کسی متبادل بنیاد پر کوئی اقتصادی نظام تشکیل دینے کی کوشش کرتے ہیں اُنہیں دُنیا بھر کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہمیں اس صورت حال کو سامنے رکھ کر اس مسئلے کو حل کرنا ہوگا۔ ابتداء ہی میں ایک اور نکتہ کی وضاحت کر دینا بھی ضروری ہے۔ افراد کا ایک گروپ ایک نئے فتویٰ کے ساتھ اس مسئلے کو حل کرنے کی سعی کرتا نظر آتا ہے۔ ان کے نقطۂ نظر کے مطابق اسلام میں سود کی ممانعت ہے نہ کہ موجودہ دور کی بنکاری اور تجارتی منافع کی۔ پاکستان میں سابقہ حکومتوں کی زیرِ سرپرستی کام کرنے والے نام نہاد تجدید پسند اسکالرز ان کا اندازِ فکر یہی تھا۔ ہمارے خیال میں یہ ایک شکست خوردہ ذہنیت کی گستاخانہ اُپج ہے۔ شکست خوردہ اس طرح کہ یہ نظریہ احساسِ کمتری اور جدید زمانے کے سامنے اپنی کم مائیگی کے اظہار کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ نام نہاد اعتدال پسند اسکالر اپنی تخلیقی صلاحیتوں اور جرأت سے کام لینے کے بجائے ہمیشہ غلاموں کی طرح مغرب کی اندھا دُھند تقلید کے عادی ہیں گستاخانہ اس اعتبار سے کہ یہ اسلام کے واضح اصولوں کو بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ مسخ کرنے کی کوشش ہے۔ اگر ہم مسلمان ہونے کے دعویدار ہیں تو ہمیں کسی حیل و حجت کے بغیر خدا کے بتائے ہوئے راستے پر چلنا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کے احکامات میں باریکیاں تلاش کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نعوذ باللہ، اللہ کے اقتدارِ اعلیٰ کو چیلنج دے رہے ہیں اور مالکِ حقیقی کے سامنے اپنے عقل و شعور کو برتر ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ گستاخی اور دریدہ دہنی کے سوا کچھ بھی نہیں۔

ہمیں اپنی بحث کا آغاز اس نقطے سے کرنا ہوگا کہ اسلام میں واضح طور پر سود کی ممانعت ہے اور اسلامی معاشرے میں اس کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں۔ ہم اپنی خواہش اور ضرورت کے مطابق اسلام اور اسلامی اصولوں کو تبدیل نہیں کر سکتے۔ بلکہ اسلامی تعلیمات کے مطابق ہمیں اپنے سماجی اور اقتصادی نظام کو اسلامی اصولوں کے مطابق ڈھالنا ہوگا۔

قرآن میں ربا کا لفظ (لغوی معنی زائد) استعمال کیا گیا ہے اس میں اصل رقم پر پہلے سے طے کیا ہوا یا مقررہ شرح سے اضافہ شامل ہے خواہ اسے سود کہہ لیجئے یا منافع۔ اسلام نے

باہمی رضامندی اور منافع میں شرکت کی بنیاد پر تجارت کی اجازت دی ہے لیکن واضح طور پر سُود کی ممانعت کر دی ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے مالی وسائل کو تجارتی یا اقتصادی مقاصد کے لئے استعمال کرنا چاہتا ہے تو اسے نفع اور نقصان دونوں ہی میں شرکت کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ کسی انصاف پسند معاشرے میں کاروبار کے سلسلے میں صرف منافع ہی منافع جائز نہیں۔ قرآن کے مطابق سُود کی کسی صورت میں بھی اجازت نہیں دراقتصادی تعلّقات کی بُنیاد تجارت اور منافع میں شرکت کے اصُول پر ہونی چاہئے۔"[۵۵]

"جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ اس طرح اُٹھیں گے جیسے انہیں شیطان نے دھکا دے دیا ہو کیونکہ یہ وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ تجارت سود کی طرح ہے۔ اللہ نے کاروبار (تجارت) کی اجازت دی ہے اور سُود سے منع کیا ہے۔۔۔۔۔۔۔"

"اللہ نے سود کو بُرا کہا ہے اور خیرات دینا فائدہ مند قرار دیا ہے۔ اللہ گنہگاروں اور بدکرداروں کو پسند نہیں کرتا (القرآن پارہ دوم ۲۷۶-۲۷۵)

"اے ایمان والو! اللہ کے مقرر کئے ہوئے فرض پورے کرو اور جو کچھ سود کا بقایا ہے

---

[۵۵] اقتصادی نقطہ نظر سے منافع اور سود میں کوئی فنی یا بنیادی فرق نہیں ہے۔ اقتصادی نظریہ سے یہ کہنا غلط ہے کہ کم شرح کی صورت میں سود ہوتا ہے۔ ڈاکٹر انور اقبال قریشی نے اپنی کتاب "ISLAM AND THE THEORY OF INTEREST" میں لکھا ہے:-

"منافع اور سود میں کوئی فرق نہیں۔ منافع کی ایک شرح (۸½ فیصد) جو بیس سال پہلے مجلس اقوام عالم کی مالیاتی کمیٹی جیسے ماہر ادارے کی نظر میں معقول و مناسب تھی، آج اقتصادی اعتبار سے ایک پسماندہ ملک بھی اسے انتہائی نامناسب اور بہت بھاری سمجھتا ہے" (ص ۱۳۹)

اُسے چھوڑ دو (اگر تم اللہ پر پکا ایمان رکھتے ہو)۔ اگر تم اس پر عمل نہ کرو گے تو اللہ اور اُسکے رسول کی طرف سے جنگ کے لئے تیار رہو۔ اور اگر تم توبہ کر لو (سود سے) تو تم کو تمہارا اصل مال مل جائے گا۔ نہ تم کسی پر ظلم کرنے پاؤ گے اور نہ تم پر کوئی ظلم کرنے پائے گا۔" (القرآن پارہ دوم ۲۷۸ — ۲۷۹)

"اے ایمان والو، سُود نہ کھاؤ۔ اپنی رقم کو دوگنا اور چوگنا نہ کرو۔ اللہ سے ڈرو تاکہ تم سُرخرو ہو سکو۔" (القرآن پارہ دوم ۱۳۰)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس سلسلے میں واضح طور پر فرمایا:

"اللہ کے رسول نے سود کھانے، سود دینے والے، دستاویز تیار کرنے اور اس دستاویز پر دستخط کرنے والوں پر لعنت کی اور کہا (گناہ کے اعتبار سے) یہ سب ایک جیسے ہیں۔" (مُسلم)

اسلام کے ان اصولوں کی روشنی میں مُسلمانوں نے ایک بلا سُود معیشت قائم کی اور بلا سود بنکاری اور تجارت کا نظام رائج کیا۔ خود ہندوستان میں مغل حکومت کے زوال تک یہ نظام رائج تھا۔ صرف پچھلے دو سو برس سے ہمارے اقتصادی نظام سے سود کی جونک چمٹی ہوئی ہے۔ جبکہ اس سے پہلے مُسلمانوں اور ہندوؤں کے اپنے اپنے اقتصادی نظام رائج تھے۔ بنا بریں کوئی سبب نہیں کہ ہم اپنی قدروں اور روایات کے مطابق آج بھی ایک نیا اقتصادی نظام تیار نہ کر سکیں۔

مندرجہ بالا نکات کی وضاحت کے بعد ہم مختصراً سُود کی خرابیوں پر روشنی ڈالیں گے۔ ہمیں یہ سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے کہ سود کس طرح نہ صرف ہمیں بلکہ پوری نسلِ انسانی کو گھُن کی طرح کھا رہا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ کم و بیش تمام مذاہب اور ہر دور کی تہذیب نے سُود کی مذمت کی ہے۔ حتیٰ کہ ہر زمانے کے فلسفیوں اور مفکرین نے (ما سوا زمانہ جدید کے مفکرین)

سود کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا ہے ٭۔ زمانہ قبل از تاریخ میں بھی اقتصادی زندگی میں سود نام کی کسی شئے کا وجود نہ تھا۔ یہ درست ہے کہ چند افراد بھاری منافع کے ساتھ رقم کا لین دین کرتے تھے مگر یہ طریقہ کسی زمانہ میں بھی اقتصادی نظام کا جزو لازم نہیں بنا۔ اس قسم کا لین دین خال خال ہوا کرتا تھا پھر بھی اسے حرص و طمع گردانا جاتا اور اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ تاہم موجودہ سرمایہ دارانہ عہد کے آغاز میں چند تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ منافع کو اقتصادی نظام کا جزو لازم بلکہ بنیاد قرار دے دیا گیا۔ سرمائے اور محنت کو دو الگ شعبوں میں تقسیم کر دیا گیا اور اسی مقام سے کشمکش کا آغاز ہوا۔ سرمائے کے بل پر لوگوں نے محنت اور ہنر مندی پر اپنی اجارہ داری قائم کر لی اور بنکوں اور قرضہ دینے والے اداروں کا ایک جال اس طرح پھیلا دیا گیا کہ پوری معیشت اُن کی محتاج بن کر رہ گئی۔ اقتصادی تنظیم کی باگ ڈور سرمائے داروں کے ہاتھوں میں چلی گئی اور وہ منافع کی آڑ لے کر اپنے مقاصد حاصل کرنے لگے۔ ENCYCLOPAEDIA BRITANNICA میں سرمایہ داری کے موضوع پر مقالے کے مصنف نے بجا طور پر کہا ہے :-

" اگر کسی معاشرے میں اقتصادی ترقی نجی شعبے کے تاجروں کے ہاتھ میں ہو تو اس معاشرے کو سرمایہ دارانہ معاشرہ کہیں گے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اجتماعی (NON PERSONAL) سازوسامان کو نجی شعبے کی ملکیت میں دے دیا جائے۔ دوئم یہ کہ نجی شعبے میں پیداوار ہو یعنی نجی شعبے کی سرگرمی سے نجی منافع کیلئے مال تیار کیا جائے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ تیسرا اہم پہلو یہ بھی ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کی بقا کے لئے بنکوں کے ذریعہ قرضے فراہم کئے جائیں ٭٭"

٭ مثال کے طور پر سقراط، افلاطون اور ارسطو نے سود کی مذمت کی ہے۔ (حوالہ
(ARISTOTLE, POLITICS, BOOK I CHAP X اور PLATO, LAWS BOOK V
٭٭ ENCYCLOPAEDIA BRITANNICA (1962) VOL. IV, P. 801

تفصیلی جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کی تخلیق کا اہم ترین اور بنیادی عنصر منافع (سود) ہی ہے۔ سود ہی کی وجہ سے حقیقی سرمایہ دار اور سرمایہ کار دو الگ شخصیت بن گئے ہیں اور مفاد پرستوں کا ایک طبقہ وجود میں آگیا ہے۔ رقم قرض دینے والے پیداوار سے بالکل الگ ہوگئے ہیں اور وہ تجارت کے نقصانات اور ذمہ داری اٹھائے بغیر تجارت کے حقیقی مالک بن بیٹھے ہیں۔ دوسروں سے رقم لے کر کاروبار میں لگانے والا ایک مستقل اور بااثر طبقہ موجود ہے جس کے نتیجے میں ایک ایسا درمیانہ گروہ بھی وجود میں آگیا جس کا اگرچہ پیداوار اور سرمایہ کاری سے کوئی تعلق نہیں تاہم صارفین پر زیادہ سے زیادہ بوجھ ڈال کر خود زیادہ سے زیادہ خوش حال بنتا جا رہا ہے جبکہ لاگت اور قیمتوں میں اضافے کا تمام تر بوجھ صارفین ہی کو برداشت کرنا پڑ رہا ہے اور بنکار کے منافع کی صورت میں مختلف سطحوں پر سود کی شرح زیادہ سے زیادہ اونچی ہوتی جا رہی ہے۔ یہ ایک تاریخی عمل ہے کیونکہ بنکاری کی ترقی اور سرمایہ دارانہ نظام کی تخلیق دونوں ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ اس نظام میں معیشت کی اس طرح شیرازہ بندی کی گئی کہ ساہوکاری ترازو ہی معیشت کا اصل محور بن کر رہ گئی اور ہر چیز سود کے اس محور کے گرد حرکت کر رہی ہے [۴۴]

اس طرح ہر شخص اور ہر چیز پر سود کی مہر ثبت کر دی گئی۔

ہمارے پاس اس بات کا بیّن ثبوت موجود ہے کہ چند مفاد پرستوں کے ایک گروہ

---

۴۴ مغرب کے ایک ممتاز اقتصادی ماہر پروفیسر J.A. SCHUM PETER نے اس تبدیلی (یعنی سود کی شرح کو ہر شے کا پیمانہ مقرر کرنے) کی یوں تعریف کی ہے:-

" سرمایہ دارانہ ذہنیت کے وجود میں آنے سے ایک سود مند روایت بھی پیدا ہوئی ہے، وہ یہ کہ ذاتی سروسوں کے سوا ہر مد میں منافع کو اصل سرمائے کے منافع کے طور پر ظاہر کیا جائے۔ مثال کے طور پر جرمنی میں چودھویں صدی کے بعد سے اس اصول پر عمل ہو رہا ہے"۔

(SCHUMPETER BUSINESS CYCLES, VOL. II, P. 608)

نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق سود کی لعنت کو معیشت اور معاشرے پر تھوپنے کی کوشش کی اور اس میں کامیاب ہوگیا۔ یہاں ہم FUGGERS کے بنکنگ ہاؤس کی مثال دیں گے جس نے سود کے حق میں راہ ہموار کرنے کے لئے ۱۵۱۵ء میں ایک "ممتاز" اسکالر JOHN ECK کی خدمات حاصل کیں۔ اس سلسلے میں اقتصادی مورخ R.H. TAWNEY نے لکھا ہے:۔

" ایک (ECK) نے بولونا (BOLOGNA) یونیورسٹی سے اپنے اس جرأت مندانہ نظریے کی تصدیق حاصل کرنے کے لئے اٹلی کا سفر کیا کہ تاجروں کے باہمی لین دین میں قانونی طور پر سود وصول کیا جا سکتا ہے۔ سرمایہ داروں کے ایک گروہ نے جو FUGGERS کے بنکنگ ہاؤس سے تعلق رکھتا تھا فوراً موقع سے فائدہ اٹھایا اور "حق کی تلاش" کی اس نفع بخش مہم میں سرمایہ فراہم کرنے کی پیشکش کی۔ (ECK وہ مشہور دانشور ہے جس کا لوتھر (LUTHER) سے معرکہ ہوا تھا)۔

یہ بات بھی کم اہمیت کی حامل نہیں ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام اور جدید بنکاری کے بانی وہ لوگ ہیں جو ہر زمانے میں رقم اُدھار دینے اور سود پر کاروبار کرنے میں مصروف تھے اور یہ لوگ ہیں — یہودی ساہوکار۔ ان لوگوں نے سرمایہ دارانہ نظام کی تشکیل میں جو کردار ادا کیا ہے، جرمن مورخ اور ماہر عمرانیات WARNER SOMBART نے اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔*

RELGION AND THE RISE OF CAPITALISM ۴
BY R.H.TAWNEY صفحہ ۹۰

* — مقالہ بعنوان ENCYCLOPAEDIA OF SOCIAL SCIENCES
THE CAPITALISM اور WARNER SOMBART کی تصنیف
JEWS AND MODERN CAPITALISM ترجمہ
M.EPSTEIN مطبوعہ لندن ۱۹۱۳ء

اور یہ بات بھی محض اتفاق نہیں ہے کہ اقتصادی علوم کے (قدیم و جدید) تقریباً تمام ممتاز اسکالر جنہوں نے سود کے لئے نظریاتی جواز فراہم کیا ہے ایک ہی گروپ سے تعلق رکھتے ہیں۔ J. M. KEYNES ، DAVID RICARDO ، ADAM SMITH ، PAUL . A . SAMUELSON ، N . KALDOR ان سب کا ایک مخصوص گروپ سے تعلق ہے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ جو کام یہ لوگ صدیوں سے چوری چھپے کرتے آئے تھے وہ اب اقتصادی نظام کا ایک جزو لازم بن چکا ہے۔ آج ساری دُنیا گنتی کے چند ساہوکاروں اور سرمایہ داروں کے ہاتھ میں ہے جو دوسری تمام اقوام اور افراد کے مقدر کے مالک بنے ہوئے ہیں۔

کارل مارکس* جو اسی سرمایہ دارانہ نظام اور یہودی روایات کا علمبردار تھا' بخوبی جانتا تھا کہ افراد اور اقوام کے استحصال کے سلسلے میں سود کتنا مُفید کردار ادا کر سکتا ہے۔ اُس نے سُود کی مذمت کی اور خیال ظاہر کیا کہ سرمایہ داری کے خاتمہ کے ساتھ ساتھ سود کا وجود بھی ختم ہو جائے گا۔ بایں ہمہ اس دعوے کے باوجود کہ روس میں سوشلسٹ نظام کے ہاتھوں سرمایہ داری کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ آج بھی دُنیا بھر میں سُود کا کاروبار جاری ہے۔ ۱۹۲۸ء میں رُوس کی اشتراکی حکومت نے سودی بونڈز جاری کئے جن پر سُود کی شرح سرمایہ دار نظام کے مُلکوں کی شرح سے کہیں زیادہ تھی۔ ان تمسکات پر سود کی شرح ۸ سے ۱۲ فیصد تک تھی۔** ۱۹۳۶ء میں پچھلے تمام تمسکات کو چار فیصد والے نئے تمسکات میں منتقل کر دیا گیا اور ۱۹۵۸ء تک ان تمسکات کی فروخت کم و بیش لازمی رہی۔ ان تمسکات سے ۱۹۴۰ء میں

---

* مارکس پیدائشی یہودی تھا اور اس کا شریک کار اور مالی معاون ENGELS ، انگلستان کا ممتاز سرمایہ دار تھا۔

** ملاحظہ کیجئے پروفیسر ALEO NOVE کی کتاب AN ECONOMIC HISTORY OF U.S.S.R مطبوعہ ۱۹۶۹ء صفحہ ۲۵۴

سرکاری خزانے کو گیارہ ارب (MILLIARD) روبل اور ۱۹۴۵ء میں اُنتیس ارب روبل حاصل ہُوئے۔[۵۵] سود کے کاروبار کا صرف یہی ایک پہلو نہیں ہے بلکہ یہ کاروبار پوری معیشت میں جاری وساری نظر آتا ہے۔ پروفیسر ALEO NOVE کی کتاب THE SOVIET ECONOMY (تیسرا ایڈیشن مطبوعہ ۱۹۶۹ء) کے چند اقتباسات سے اس امر پر وافر روشنی پڑتی ہے کہ اشتراکی نظام میں بھی سود کا لین دین موجود ہے:۔

"سرکاری قرضوں سے آمدنی کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(۱) **عوامی قرضہ جات:** یہ قرضے، پریمیم بونڈز کی خریداری کے لئے جاری کئے گئے تھے اور یہ رقم لازمی طور پر لوگوں کی اُجرت سے کاٹ لی جاتی تھی۔ قرعہ اندازی کے ذریعے انعامات تقسیم کئے جاتے جن میں سود کی شرح پہلے چار فیصد، پھر تین فیصد اور آخر میں کل رقم کا دو فیصد ہوتی تھی۔ (ص ۱۱۶-۱۱۵)

(۲) قرضوں کی دوسری شکل یہ تھی کہ سرکاری بنک جس میں (۳ فیصد شرح سود پر) عوام کی بچت جمع کی جاتی تھی، سرکاری سُودی تمسکات خریدتے تھے۔ ان بنکوں میں ہر سال عام لوگ جتنی رقم جمع کرتے تھے، اتنی ہی رقم کے تمسکات خریدنا لازمی تھا۔

(۳) اس کے علاوہ کچھ دوسرے تمسکات بھی فروخت کئے جاتے تھے جن میں خاص طور سے عام افراد اپنی خوشی سے رقم لگا سکتے تھے۔" (ص ۱۱۶)

"چند اسباب کی بناء پر مرکزی سرمایہ کاری کے منصوبے کے تحت دیئے جانے والے قرضوں پر صرف ½ فیصد سالانہ کی شرح سے سُود لیا جاتا جبکہ مختلف ریاستوں کے منصوبوں

---

۵۵ حوالہ پروفیسر ALEO NOVE کی کتاب AN ECONOMIC HISTORY OF U.S.S.R. ص ۲۸۴

کے لئے سُود کی شرح ۲ فیصد تھی"۔ (ص ۱۲۴)

"سرکاری کاروبار کے لئے مختصر مدت کے قرضوں پر سُود کی شرح ۲ فیصد اور اکثر صورتوں میں اس سے کم یا قرضے کی ادائیگی کی مدت گزر جانے کے بعد شرح تین فیصد ہوتی تھی۔ بنک اپنے منافع کی کچھ رقم اپنے پاس بھی رکھتا تھا"۔ (ص ۱۲۹-۱۲۸)

ان تمام حقائق کی بُنیاد سرکاری دستاویزوں پر ہے اور دُنیا بھر میں اشتراکی اقتصادی ماہرتک، پروفیسر NOVE کو رُوس کی اقتصادیات کا ماہر سمجھتے ہیں۔

اس باب میں ہم نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ عالمی معیشت پر سُود کی لعنت چند مفاد پرستوں نے مسلّط کی ہے۔ سُود کو سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکی نظام کا ایک لازمی جزو بنا دیا گیا ہے * سُود، سرمایہ دارانہ ذہنیت کی پیداوار ہے اور اب یہ ذہنیت دُنیا بھر میں کارفرما نظر آتی ہے۔ پہلے تو سود کا کاروبار چند افراد کا ایک غیر قانونی فعل تھا مگر اب ایک قانونی اور باعزّت تجارت بن گیا ہے۔ جس میں دُنیا بھر کے بنکار، سرمایہ کار اور حکومتیں برابر کی شریک ہیں۔ گنتی کے چند افراد عالمی معیشت کی باگ ڈور سنبھال بیٹھے ہیں اور پوری دُنیا سرمایہ داروں کے رحم وکرم کی محتاج بن کر رہ گئی ہے۔ ان سرمایہ داروں نے دُنیا کے تمام مُلکوں میں مختلف طریقوں سے جنہیں کسی صُورت میں بھی جائز نہیں کہا جا سکتا، اپنی اجارہ داری قائم کرلی ہے۔

یہاں ہم مختصراً اس بات پر روشنی ڈالیں گے کہ سود سے افراد اور معیشت بلکہ مملکت کے لئے کیا خطرات درپیش ہیں؟ تاہم اس پہلو پر روشنی ڈالنے سے قبل دو نکات کی وضاحت کردینا ضروری ہے:۔

(۱) آج تک کسی شخص نے بھی سود وصول کرنے کا کوئی معقول و مناسب جواز پیش نہیں کیا۔ سرمایہ داروں کے عہد سے قبل کسی شخص میں اتنی جرأت نہ تھی کہ اس زبردست استحصال کو

---

* امریکہ کی طرح رُوس بھی دوسرے ملکوں کو دئیے جانے والے اقتصادی اور فوجی قرضوں پر سود وصول کرتا ہے البتہ سُود کی شرح مختلف ہوتی ہے۔

جائز قرار دے سکے۔ سرمایہ دارانہ معیشت میں ابتدائی عہد کے کچھ اقتصادی ماہروں نے سود کے جواز پر روشنی ڈالنے کی کچھ کوشش کی لیکن ایک دلیل بھی ایسی نظر نہیں آتی جسے خود اقتصادیات کے ماہروں ہی نے مسترد نہ کر دیا ہو۔ قدیم اور جدید اقتصادیات میں سود کے جواز کے بارے میں کوئی متفقہ رائے سرے سے موجود نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ موجودہ زمانے کے اقتصادی ماہرین نے سود کا جواز تلاش کرنے کی کوشش ہی ترک کر دی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سود کی ادائیگی کے مسئلے کے کمزور پہلوؤں کے سبب انہوں نے اس پر غور کرنا ہی ترک کر دیا ہے۔ اُن کی توجہ تو اب اس بات پر ہے کہ سود کی شرح کس طرح مقرر کی جائے۔ سود اور شرح سود کا تعین دو الگ باتیں ہیں جنہیں کسی طور بھی ایک مسئلے کے دو پہلو نہیں کہا جا سکتا۔ علم و فن کی ترقی کے اس دور میں بھی کسی معاملے کا تجزیہ اور نتائج مختلف ہوتے ہیں۔ یہ اختلاف رائے اتنا شدید اور نوعیت کے اعتبار سے اس قدر بنیادی ہے کہ ابہام کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔

HABERLER کا کہنا ہے :-

" اقتصادیات کے شعبے میں سود کا نظریہ طویل عرصے سے ایک کمزور پہلو کی حیثیت رکھتا ہے۔ شرح سود کی وضاحت اور اس کے تعین کا معاملہ آج بھی اقتصادی ماہرین کے لئے دردِ سر بنا ہوا ہے۔ عام اقتصادی نظریے کے کسی اور پہلو پر اقتصادی ماہرین کو اس اختلاف رائے اور الجھنوں کا شکار نہیں ہونا پڑا جس قدر سود کے معاملے پر پایا جاتا ہے۔" ؎

؎ G. HABERLER از PROSPERITY AND DEPRESSION پہلا ایڈیشن صفحہ ۱۹۵

ہمارے لئے فی الوقت مسئلے کے اس پہلو پر مزید روشنی ڈالنا ممکن نہیں ہے۔ مزید وضاحت کے لئے ڈاکٹر انور اقبال قریشی کی کتاب ISLAM AND THE THEORY OF INTEREST اور شیخ محمود احمد کی کتاب ECONOMICS OF ISLAM دیکھئے۔

سُود موجودہ زمانے کے کسی ڈکٹیٹر کی طرح ہے جو کسی قانونی استحقاق کے بغیر اقتدار پر تسلط جما بیٹھا ہے۔ اس حقیقت سے کوئی شخص اختلاف نہیں کرے گا کہ ہمارے معاشرے میں نہ صرف سُود کا وجود ہے بلکہ اسے اقتصادیات پر مکمل کنٹرول حاصل ہے تاہم یہ آج تک ثابت نہیں ہو سکا کہ اس کا کوئی قانونی یا اخلاقی جواز بھی موجود ہے۔ قانون کی زبان میں سود موجود تو ہے مگر یہ وجود قانونی اور جائز نہیں ہے۔

(۲) سود کے حامیوں نے اس مسئلے کو مزید پیچیدہ بنانے کے لئے آج تک منافع اور سود میں واضح فرق کا تعین نہیں کیا۔ پرانے زمانے کے اقتصادی ماہرین پیداوار کے تین اجزاء پر یقین رکھتے تھے یعنی زمین، محنت اور سرمایہ اور اُن کے نزدیک پیداوار کے چار فوائد تھے۔ کرایہ، اُجرت، سُود اور منافع۔ جدید عہد کے اقتصادی ماہرین نے ایک اور جزو کا اضافہ کرنے کی کوشش کی اور یہ جزو ہے۔ کاروبار لیکن سرمایہ اور کاروبار میں واضح طور پر کوئی امتیاز پیدا نہیں کیا جا سکا۔ موجودہ عہد میں یہ تقسیم بے کار اور غیر قدرتی ہے۔ تمام اقتصادی مباحثوں میں نفع کا جواز تو مل جاتا ہے مگر سود کا کوئی جواز نہیں ملتا۔ سود اور نفع کے معاملوں کو خلط ملط کر کے اقتصادی ماہرین منافع کے جواز کو سود کا جواز قرار دینا چاہتے ہیں۔ علمی اعتبار سے یہ ایک ناپسندیدہ فعل ہے اور اسے ہر شخص قابلِ مذمت ٹھہرائے گا۔ یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ مارکس اور اشتراکی نظام کے دوسرے اقتصادی ماہرین بھی اس ابہام اور اُلجھاؤ کے ذمہ دار ہیں اگرچہ انہوں نے اس طرح اپنے دیگر مقاصد پورے کئے تھے۔ ان کے نزدیک سُود اور منافع دونوں ہی غلط اور ناجائز ہیں جبکہ سرمایہ دارانہ نظام کے اقتصادی ماہرین سود اور منافع کو جائز قرار دیتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام ہو یا اشتراکیت، دونوں جانب ہی اقتصادی ماہرین سُود اور منافع کے مسئلوں کو گڈمڈ کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ امر بھی کم تکلیف دہ نہیں کہ چند مسلمان تجدید پسند بھی، جو اپنے مغربی آقاؤں کی ہاں میں ہاں ملانے کے عادی ہیں، یہی کھیل کھیلنا چاہتے ہیں یعنی سود اور تجارتی منافع ایک ہی چیز ہے۔ قرآن نے بڑی وضاحت کے ساتھ

اس سلسلے میں ہماری یوں رہنمائی کی ہے:۔

"جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ اس طرح اٹھیں گے جیسے انہیں شیطان نے دھکا دے دیا ہو کیونکہ یہ وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں تجارت بھی سود کی طرح ہے۔

اللہ نے تجارت کی اجازت دی ہے اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔" (القرآن دوم۔۲۷۵)

تجارت ایک ایسا اقتصادی کاروبار ہے جس میں نفع اور نقصان دونوں ہی کے امکانات ہیں جبکہ سود پہلے سے طے کی ہوئی ایک رقم ہے جس کی ادائیگی نفع اور نقصان دونوں صورتوں میں کرنی لازمی ہے۔ عہدِ جاہلیت کے بااثر افراد نے سود اور منافع کو آپس میں خلط ملط کرنے کی کوشش کی تھی اور آج بھی جاہلیت کے مارے ہوئے اس کوشش میں مصروف نظر آتے ہیں۔ قرآن پاک نے دونوں گروہوں کے لئے واضح ہدایت دی ہے، تجارت (منافع اور منافع میں شرکت) حلال ہے اور سود حرام۔ اقتصادی اور اخلاقی دونوں پہلوؤں سے یہی بات عقل انسانی کے لئے سب سے زیادہ قابلِ قبول ہے۔

اب ہم فرد، معاشرے اور معیشت پر سود کے اثرات کا جائزہ لیں گے۔

۱۔ جہاں تک فرد کا تعلق ہے، سود ایک مخصوص ذہنیت کی پیداوار ہے اور یہ استحصال کی ذہنیت ہے۔ انسان نے زندگی کے اخلاقی پہلو پر نظر رکھنے کے بجائے ایک خالص مادی ذہنیت کو پروان چڑھایا ہے جس میں مال و دولت سے محبت، دوسرے تمام جذبوں پر فوقیت رکھتی ہے۔ ایک شخص صرف اسی صورت میں کسی شخص کو کوئی رقم ادھار دے سکتا ہے جب اسے اپنی رقم پر منافع ملنے کا یقین ہو۔ دولت کو خدا کی امانت کوئی نہیں سمجھتا جس سے خود فرد اور معاشرے کو فائدہ پہنچے۔ فرد کی دولت پر معاشرے کے دوسرے افراد کے استحقاق کو کوئی شخص بھی خاطر میں نہیں لاتا اور ایک مادی پیمانے ہی سے تمام حقوق و فرائض کو ناپا جاتا ہے۔ اس ذہنیت کے نتیجے میں حرص، بخل، تنگ دلی، خود غرضی اور دولت کی پرستش جیسے ناپسندیدہ فعل وجود میں آتے ہیں۔ یہی وہ ذہنیت ہے جس نے انسان کو اپنے ہی بھائی کا خون چوسنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اسے

وحشیانہ پن اور بربریت کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے؟ اور ــــ سُود ان تمام خرابیوں کی جڑ ہے۔ اس نے انسان کے کردار کے اخلاقی اور سماجی پہلو برباد کر دیئے اور ایسی کمزوریوں کو فروغ دیا جس سے آہستہ آہستہ معاشرے کی بُنیادیں کمزور ہوتی جا رہی ہیں۔ اس ماحول کا زر پرست بلکہ سود خور انسان کسی طرح بھی اشرف المخلوقات کہے جانے کا مستحق نہیں ــ وہ تو مقصدِ تخلیق کے لیے کلنک کا ٹیکہ بن چکا ہے۔

۲۔ سود خوری اور سود خوروں کا رَویّہ دونوں ہی معاشرے اور انسانیت کے لیے تباہ کن ہیں۔ اس سے افراد کے درمیان نفرت اور بے اعتمادی پھیلتی ہے اور سماجی خدمات و باہمی تعاون کا جذبہ ختم ہو جاتا ہے۔ فرد کا مطمعِ نظر محدود ذاتی فائدے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ نفع خوری اور استحصال کا رَواج ہوتا ہے اور معاشرہ ایسے گروہوں اور طبقوں میں تقسیم ہو جاتا ہے جن کے مفاد ایک دوسرے سے متصادم ہوں اور یوں معاشرے سے باہمی اشتراک و تعاون ختم ہو جاتا ہے۔

سماجی اور اقتصادی ناانصافیوں کو ہوا ملتی ہے طبقہ واری اختلافات میں روز افزوں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور اس سے معاشرے کا سماجی توازن درہم برہم ہو جاتا ہے۔

۳۔ بین الاقوامی سطح پر سود کا کاروبار کرنے والی اقوام کا بھی یہی حشر ہوتا ہے۔ سُود کے ذریعے بین الاقوامی استحصال میں اضافہ ہوتا ہے۔ کمزور اقوام قرضوں کے جال میں پھنس کر طاقت ور اور مالدار قوتوں کی محکوم ہو جاتی ہیں۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کے سبب بین الاقوامی کشیدگی، اقتصادی سامراجیت اور اسلحہ کی تجارت میں اضافہ ہوا اور نتیجتاً ہولناک جنگ کے بادل دُنیا پر چھا گئے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ کسی مُلک پر قبضہ کرنے کا ایک طریقہ تجارت بھی ہے لیکن موجودہ زمانے میں دوسرے ملکوں پر اپنا تسلّط جمانے یا تجارت بڑھانے کے لئے سود سے زیادہ ممد و معاون کوئی دوسرا ذریعہ نہیں۔ حرص پسند اقوام کے اس تباہ کن کھیل میں سود ایک کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔

۴۔ اقتصادی نقطۂ نظر سے سود کے لئے کوئی معقول و مناسب شرح چنداں ضروری نہیں۔ قرضے، سرمایہ کاری اور پیداوار میں اضافے کی غرض سے لئے جاتے ہیں۔ یا پھر افراد اپنی ضرورتیں

پوری کرنے کے لئے قرضہ کا سہارا لیتے ہیں۔ لوگوں کی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے قرضوں کا کوئی اقتصادی جواز موجود نہیں ہے۔ ان قرضوں کے پس پُشت انسانیت کی فلاح و بہبود کا جذبہ ہونا چاہیئے نہ کہ کاروبار۔ کسی بھی باشعور معاشرے میں افراد کے مصائب کو کاروبار کا ذریعہ بنانا مستحسن ہے نہ پسندیدہ۔* ضرورت مندوں اور ناداروں کی امداد معاشرے کا فرض ہونا چاہیئے۔ ناداروں کی مصیبت و ابتلا سے فائدہ اُٹھانا اور من مانے طریقے سے سود وصول کرنا ایک ناقابلِ معافی جرم ہے اور اس کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے۔ درحقیقت اقتصادی دَوڑ میں پیچھے رہ جانے والے ممالک بجا طور پر اقتصادی اعتبار سے ترقی یافتہ ملکوں سے امداد کی توقع رکھ سکتے ہیں۔ سماجی تحفظ کے تمام نظاموں کی اسی اصُول پر تشکیل کی گئی ہے۔ افراد کی نجی ضرورتوں کے قرضوں پر سود وصول کرنے سے اس اصول کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ اس طرح معاشرے کے کمزور گروپ ایک لامتناہی ناانصافی اور استحصال کا شکار ہو جاتے ہیں کیونکہ وہ خود اپنے وسائل سے اپنی ضرورتیں پوری نہیں کر سکتے۔ انہیں معاشرے کی امداد کی ضرورت ہوتی ہے نہ کہ خون چوسنے والی جونکوں کی۔

---

*ARTHER KITSON نے BUILDERS JOURNAL (اپریل ۱۹۳۹ء) میں اس امر پر روشنی ڈالی ہے کہ انگلستان جیسے ترقی یافتہ مُلک کے لئے بھی اپنا قرضہ ادا کرنا کس قدر مشکل تھا (سود مرکب کی وجہ سے)۔ KITSON نے لکھا ہے:

" ۳۱ مارچ ۱۹۱۹ء کو ہمارے قومی قرضے کی رقم سات ارب ۴۳ کروڑ ۴۹ لاکھ ۴۹ ہزار چار سو تہتیس پونڈ تھی۔ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۳ء تک اس سلسلے میں چار ارب دس کروڑ اڑتالیس لاکھ تین ہزار ترسٹھ پونڈ کی ادائیگی کی جا چکی تھی۔ اسی مدّت میں قرضے کے سود کے طور پر چار ارب بائیس کروڑ اناسی لاکھ پچیس ہزار ایک سو چھیاسی پونڈ ادا کیا جا چکا تھا۔ اس کے باوجود ۳۱ دسمبر ۱۹۳۳ء کو ہمارا قومی قرضہ (جس میں امریکہ سے ملنے والا قرضہ بھی شامل تھا) سات ارب ۹۴ کروڑ ستّر لاکھ پونڈ تھا جو ۳۱ مارچ ۱۹۱۹ء کو اصل قرضے کی رقم سے ۵۱ کروڑ بیس لاکھ پونڈ زیادہ تھا۔

(باقی بر صفحہ آئندہ)

انہیں تو اپنے اقتصادی حالات بہتر بنانے کے لئے ایک اضافی اقتصادی سہارے کی ضرورت ہے۔ ان سے سود وصول کرنے کا آخر کونسا اخلاقی اور سماجی جواز موجود ہے؟ اگر حالات کی رفتار یہی رہی تو وہ دائمی طور پر قرضے کے بوجھ تلے دبے رہیں گے۔ انکی قوّت خرید پہلے ہی بہت کم ہے اور سود سے اس میں اور کمی ہو جائے گی۔ ایک صحت مند معاشرے کے لئے لازم ہے کہ وہ نادار افراد کی ضرورتیں پوری کرنے کا معقول بندوبست کرے اور انہیں یہودی صفت ساہوکاروں کے رحم وکرم پر نہ چھوڑے۔ نجی ضرورتیں پوری کرنے کے قرضوں پر سود کو ایک جائز اور قانونی تشکل ملنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ معاشرے کی اقتصادی بنیاد کمزور ہے اور عوام کے سماجی تحفظ کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ یہی سبب ہے کہ بیشتر پسماندہ ملکوں میں کثیر افراد قرضے کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں۔ ہندوستان کی زراعت کے بارے میں شاہی کمیشن کی رپورٹ کے مطابق "ہندوستانی کاشتکار، قرضے میں جکڑا ہوا پیدا ہوتا ہے، زندگی بھر قرضے کو ادا کرنے کی جدوجہد کرتا رہتا ہے اور آخر کار قرضے کے بوجھ کے ساتھ ہی مرجاتا ہے"۔ دُنیا کے تمام پسماندہ ملکوں میں غریب افراد کی یہی حالت ہے اور ان لوگوں سے قرضوں پر جو سود لیا جاتا ہے وہ ان کے گوشت اور خون کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ان لوگوں سے جو سود وصول کیا جاتا ہے اس کی شرح بے پناہ ہے۔ پسماندہ ملکوں میں عوام سے حقیقی رابطہ رکھنے والا ہر شخص ان حالات سے بخوبی واقف ہے۔ لیکن جو لوگ اس نکتے کے حق میں ٹھوس شہادت چاہتے ہیں اُن کے اطمینان کے لئے ہم مندرجہ ذیل حقائق پیش کرتے ہیں۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔

دوسرے لفظوں میں برطانیہ نے قرضے کی ادائیگی اور سود کے سلسلے میں ۳۱ مارچ ۱۹۱۹ء کے اصل قرضے کے مقابلے میں ۲۰۷ کروڑ اسّی لاکھ پونڈ زیادہ ادا کئے اور اصل قرضے کی رقم میں ایک پیسے کی بھی کمی نہیں ہوئی"۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ افراد کے بجائے اقوام کو قرضے دینا زیادہ فائدہ مند ہوتا ہے۔ مسٹر Kitson نے اپنی کتاب The Bankers Conspiracy میں لکھا ہے کہ قرضوں کے سلسلے میں حالات متذکرہ بالا اعداد و شمار سے زیادہ دگرگوں تھے۔

نیویارک ٹائمز کی اطلاع ہے کہ کراچی کی ایک لانڈری کے مالک کو سو روپے کے قرضے پر تین ہزار نو سو پچیس روپے بطور سود ادا کرنا پڑا۔ اخبار کی اطلاع کے مطابق ان نادار لوگوں سے ۲۵ فیصد ماہانہ یا تین سو فیصد سالانہ کے حساب سے سود وصول کیا جاتا ہے۔ (نیویارک ٹائمز ۱۷ جنوری ۱۹۵۵ء)

ہندوستان میں دیہی قرضے کے بارے میں ایک حالیہ رپورٹ کے مطابق ان قرضوں پر سود کی عام شرح ۵۰ سے ۷۰ فیصد سالانہ تک ہوتی ہے اور اگر قرضخواہ یہ سود باسانی ادا نہیں کر سکتا تو شرح میں اور زیادہ اضافہ ہو جاتا ہے۔

(ALL INDIA RURAL CREDIT SURVEY VOL. II P. 173)

ایشیاء اور مشرق بعید کے لئے اقوام متحدہ کے اقتصادی کمیشن (ECAFE) کی رپورٹ کے مطابق انڈونیشیا اور ملیشیا میں سود کی شرح ۴۰ سے ۱۰۰۰ فیصد سالانہ تک ہوتی ہے۔

(U.N., CREDIT PROBLEMS OF SMALL FARMERS IN ASIA AND THE FAR EAST.) (1957, P. 12)

اقوام متحدہ کی ایک اور رپورٹ کے مطابق فلپائن میں سود کی شرح ۲۵ سے ۴۰۰ فیصد سالانہ ہے۔

(U.N., PROGRESS IN LAND REFORMS, P. 213)

ہمارے ارد گرد ایسی ہی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ اگر یہ ناداروں کا استحصال اور ان پر ظلم نہیں تو کیا ہے؟ اگر کوئی معاشرہ اس بھیانک ظلم کو گوارہ کر سکتا ہے تو کون سا ایسا جرم ہے جسے وہ معاشرہ برداشت نہیں کرے گا۔

ہم یہاں مزید دو نکات بیان کریں گے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ممکن ہے کچھ لوگ کہیں کہ شاید یہ قرضے نجی ضرورتوں کے لئے نہیں بلکہ اقتصادی ضروریات (کاروبار وغیرہ) کے لئے حاصل کیے گئے تھے۔ ممکن ہے یہ درست ہو مگر نادار افراد کے اقتصادی حالات اتنے دگرگوں ہیں کہ ان کی اقتصادی ضرورتوں اور نجی ضروریات کے درمیان کوئی واضح فرق مشکل ہے۔ یہی سبب ہے

کہ ہم نے اس فرق کو نمایاں کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ ان میں سے بیشتر افراد کاشتکاری سے وابستہ ہیں اور اپنی پیداوار کا کچھ حصہ خود استعمال کرتے ہیں اس لئے یہ فرض کرلینا کہ وہ اپنی نجی ضروریات پوری کرنے کے لئے قرضے لیتے ہیں بے جا نہ ہوگا۔ جہاں تک خالصتاً اقتصادی ضروریات کے لئے قرضے کے حصول کا تعلق ہے اس سلسلے میں ہم آئندہ صفحات میں روشنی ڈالیں گے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس امر کی ضرورت ہے کہ ان قرضوں کے اقتصادی نتائج کی چھان بین کی جائے۔ اگر کوئی شخص اپنی ناگزیر ضروریات پوری کرنے کے لئے قرضہ لیتا ہے تو اس کی ساری عمر قرضے اور سود در سود کی ادائیگی میں گزر جاتی ہے۔ ان حالات میں کھپت کی سطح کم ہی رہتی ہے۔ اس لئے مانگ میں بھی کمی ہوتی ہے اور اس سے ملک کی پیداوار متاثر ہوتی ہے۔ نادار افراد کی اقتصادی کوششیں عام سطح سے کم ہو جاتی ہیں اور اس سے پیداوار کے محرکات متاثر ہوتے ہیں۔ ان تمام باتوں کے نتیجے میں معیشت کو جو پہلے ہی کمزور ہوتی ہے مزید نقصان پہنچتا ہے۔ چونکہ یہ افراد اقتصادی اعتبار سے بدحال ہوتے ہیں بنابریں وہ قرض لینے اور سود کی ادائیگی پر مجبور ہوتے ہیں۔ قرضے کے بوجھ تلے دب کر اور سود کے جال میں پھنس کر ان کی اقتصادی سرگرمیاں کم ہو جاتی ہیں اور غربت میں مزید اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ غرض کہ وہ ایک ایسے جال میں پھنس جاتے ہیں جس سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں۔

۵۔ اب ہم قرضوں کی دوسری شکل پر روشنی ڈالیں گے۔ یہ وہ قرضے ہیں جن کا مقصد پیداوار میں اضافہ ہے۔ ان قرضوں کا حقیقی اقتصادی جواز صرف یہ ہے کہ ان قرضوں سے پیداوار میں اضافہ ہوتا ہے۔ اگر یہ حقیقت ہے تو سرمایہ لگانے والے کو پیداوار میں اضافے کے منافع میں حصہ ملنا چاہئے۔ یہ قطعی منصفانہ اور معقول نکتہ ہے اور کسی شخص کو اس پر اعتراض نہیں ہے۔ اعتراض تو سود کی شرح پر ہے جو پہلے سے مقرر کرلی جاتی ہے اور جس کا پیداوار میں اضافے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اگر منصوبہ ناکام بھی ہو جائے تب بھی سود کی ادائیگی سے مفر نہیں۔ اقتصادی، اخلاقی اور سماجی اعتبار سے منافع میں شرکت تو ہر طرح جائز ہے لیکن پیداوار کی بنیاد پر سود کا کوئی جواز نہیں۔

سود کی بنیاد یہ ہے کہ سرمایہ کاری کو نفع نقصان کے امکان، ذمہ داری اور پیداوار سے الگ رکھا جائے اقتصادی سرگرمی کے لئے یہ انتہائی تباہ کن بات ہے۔ یہ اصول، صحت مندانہ تجارت کے لئے مہلک ہے اور اس سے معاشرہ میں سازشوں، ناپسندیدہ حرکتوں، استحصال اور عدم استحکام کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس رجحان کے سبب تجارتی سرگرمیاں اپنی فطری بنیاد سے ہٹ گئی ہیں اور پورا اقتصادی نظام بدہیئت ہو گیا ہے۔ بہت سی غلط چیزیں رواج پا گئی ہیں اور زندگی کا سکون درہم برہم ہو گیا ہے۔ ہم مختصراً اس رجحان کے معیشت پر اثرات کا ذکر کریں گے:۔

(۱) سود کی شرح بڑھانے پر معیشت: یہ سرمایہ دار اور بینکار کی گرفت مضبوط کرنے کیلئے معاشرے کے اقتصادی وسیلوں کے کچھ حصے سے کام نہیں لیا جاتا۔ آخری تجزیے میں اس سے اقتصادی سرگرمیوں میں کمی آ جاتی ہے۔ یورپ کے صنعتی انقلاب کے دور کے ایک ممتاز فلسفی LOOKE نے اپنے ایک تاجر دوست کے حوالے سے لکھا ہے:۔

"سود کی شرح میں اضافہ سے تجارت تباہ ہو جاتی ہے کیونکہ سود، تجارت سے منافع سے بہتر ہے۔ یہی سبب ہے کہ مالدار تاجر اپنے سرمایہ سے سود کماتے ہیں جبکہ عام تاجروں کا کاروبار ختم ہو جاتا ہے۔"

یہ ایک کاروباری آدمی کا بیان ہے اور بیشتر تاجر اس خیال کی تائید کریں گے صرف تاجر طبقہ ہی نہیں ممتاز اقتصادی ماہرین نے بھی اس خیال سے اتفاق کیا ہے۔ انہوں نے اپنے انداز میں وقتاً فوقتاً رائے ظاہر کی ہے کہ سود کی شرح میں اضافہ سے آگے چل کر تجارت و صنعت کو نقصان پہنچتا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اس سے معیشت کی صحت مندانہ ترقی میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ اس سے متوازن ترقی کی راہ رک جاتی ہے اور نتیجتاً چند لوگ بے پناہ دولت کے مالک بن جاتے ہیں جبکہ بڑی تعداد میں حقیقی اور اصل سرمایہ کار اپنے جائز منافع سے بھی محروم ہو جاتے ہیں اور معیشت کی پیداواری حدیں پوری نہیں ہو پاتیں۔ J.M.KEYNES

اور GUSTAV CASSEL** نے اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے اور سود کی شرح کم کرنے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ KEYNES نے تجویز پیش کی ہے کہ کسی ترقی یافتہ معیشت کے لئے سود کی مناسب شرح صفر فیصد ہے یعنی سود کا وجود ہی نہ ہونا چاہیے۔

(۳) سود سے وسیلے تقسیم کرنے کا پورا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے کیونکہ ان وسیلوں سے ان سمتوں میں کام نہیں لیا جا سکتا جہاں عام لوگوں کی حقیقی ضرورتیں بہترین طریقے پر پوری کی جائیں۔ اس کے برعکس ان وسیلوں سے سود کا کاروبار کرنے والوں کی حرص و طمع کو تسکین ملتی ہے۔ ان حالات میں طویل المیعاد منصوبوں کو نقصان پہنچتا ہے اور کسی ملک کے سماجی تقاضوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے جس سے اقتصادی بنیادیں کمزور رہ جاتی ہیں۔ سرمایہ دار طبقہ اپنے سرمائے اور منافع کے جلد حصول کو ترجیح دیتا ہے اور معیشت کی متوازن ترقی رک جاتی ہے۔ اس مقصد کے لئے سامانِ تعیش کی پیداوار میں اضافہ ہوتا ہے جبکہ روزمرہ کے استعمال اور عام لوگوں کے کام آنے والی چیزوں کی پیداوار کی طرف کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔ رفاہ عامہ کے کاموں کے لئے سرمائے کی فراہمی میں خلل پڑتا ہے اور اگر یہ سرمایہ مل بھی جائے تو سود کی شرح بہت زیادہ ہوتی ہے۔ سود سے پیداواری لاگت میں اور اس کے نتیجے میں مال کی قیمتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ قیمتوں میں اضافے کا بوجھ عام صارفین کو برداشت کرنا پڑتا ہے اور ان کے لئے زندگی دشوار سے دشوار تر ہو جاتی ہے۔ عام آدمی کے لئے زندگی کو دشوار تر بنا کر اور افراطِ زر کو طرزِ زندگی ٹھہرا کر ہی زیادہ سے زیادہ سود کمایا جا سکتا ہے۔

** ملاحظہ کیجئے KEYNES کی GENERAL THEORY OF INTEREST, MONEY AND EMPLOYMENT خصوصاً صفحات ۳۷۰-۳۴۴ اور G. CASSEL کی تصنیف NATURE AND NECESSITY OF INTEREST صفحات ۱۴۴-۱۰

(۳) اب بیشتر اقتصادی ماہرین یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ تجارت کے سلسلے میں سود ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔ تجارت میں گرم بازاری اور مندا ین دونوں ہی بڑی حد تک مالیاتی نظام کی پیداوار ہیں۔ اس سلسلے میں بنکوں کا کردار خاص اہمیت رکھتا ہے کیونکہ بنکوں کا بنیادی مفاد سُود ہے۔ یہی سبب ہے کہ معیشت کی ترقی کے ساتھ قرضوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور جلد ہی معیشت کی مقررہ حدوں سے گزر جاتا ہے۔ اسی طرح معاشی بدحالی کے زمانے میں قرضوں کا حصول اور قرضوں کی رقم کی واپسی دشوار ہو جاتی ہے۔ مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ جب اقتصادی حالات قیمتوں پر پابندی کے متقاضی ہوں تو قرضے کا حصول آسان ہوتا ہے اور جب اقتصادی حالات نازک ہوں تو قرضہ حاصل کرنا دشوار ہوتا ہے یوں اقتصادی حالات مزید نازک ہو جاتے ہیں اس بندوبست کا تاجر طبقہ پر جو نفسیاتی اثر پڑتا ہے وہ بھی کافی اہمیت کا حامل ہے۔ اگر کوئی تاجر قرضوں کے سہارے کاروبار چلا رہا ہے تو اُسے غیر ضروری اندیشوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ درآمدی تاجر اپنی ضرورت سے زیادہ مال درآمد کر لیتے ہیں کیونکہ بنک اس مال کی درآمد کے لئے قرضہ دینے کو تیار ہوتے ہیں اور اس طرح درآمد کئے جانے والے مال پر سٹہ میں اضافہ ہوتا ہے۔ حقیقی وسائل کے ذریعہ تجارت کا مصنوعی پھیلاؤ ممکن نہیں اس کا سبب تو بنکوں کی طرف سے قرضوں کی سہولتیں ہیں۔ اِن تمام باتوں سے گرم بازاری اور مندا ین کو فروغ ملتا ہے۔ رات ہی رات میں کئی لوگ لکھ پتی ہو جاتے ہیں اور کئی لوگوں کا دیوالہ نکل جاتا ہے۔ اُدھر تجارت کے نامناسب پھیلاؤ اور تباہ کن مندے سے بے روزگاری کا خوفناک مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ بازار کے اس اُتار چڑھاؤ کی بے روزگاری اور نقصان کی صورت میں جو قیمت ادا کرنا پڑتی اس کا تصور بھی بھیانک ہے۔ معیشت کو یہ نقصانات دیگر باتوں کے علاوہ سُود اور قرضے فراہم کرنے والے اداروں کی پالیسیوں کے سبب اُٹھانے پڑتے ہیں۔*

---

* ملاحظہ کیجئے KEYNES کی تصنیف GENERAL THEORY اور HABERLER کی تصنیف PROSPERITY AND DEPRESSION ۔ GORDON نے بھی اپنی تصنیف

(واضح ہے)

(۴) چند ہاتھوں میں دولت جمع ہونے کا ایک اہم سبب سود بھی ہے۔ سود کے حق میں دلائل اس کے متقاضی ہیں کہ ارتکاز دولت کم سے کم لوگوں تک محدود رہنا چاہیے اور دولت کی تقسیم مساوی رہنی چاہیے (ایک چھوٹے سے گروہ کو اپنے سرمائے پر مقررہ شرح سے سود ملتا ہے جبکہ دوسرے لوگوں کو بازار کے اُتار چڑھاؤ کے مطابق نفع یا نقصان کا سامنا کرنا پڑے)۔ چند ریاضی دانوں کا کہنا ہے کہ وہ ریاضی کے ایک عام اصول کے مطابق یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ اگر نفع نقصان کی تقسیم کا موجودہ نظام جاری رہا تو کچھ عرصے بعد ایک ایسا وقت آئے گا جب دُنیا کی تمام دولت، چند ہاتھوں میں محدود ہو جائے گی اور یہ وہ لوگ ہوں گے جو سود کا کاروبار کرتے ہیں۔" یہ محض ایک نظریاتی دلیل نہیں۔ مُلک کی اقتصادی دولت حقیقی طور پر چند لوگوں تک محدود ہوتی جا رہی ہے۔ موجودہ زمانے ہی میں بینکار حقیقی حکمران بن چکے ہیں۔ مُلک کی تمام دولت ان کے پاس جمع ہو رہی ہے اور سب لوگ اُن کے ہاتھوں کٹھ پتلیاں بنے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں ہم چند حقائق پر روشنی ڈالیں گے:۔

فرانس کے تین بڑے بینکوں THE CREDIT LYONNAIS، THE COMPTOIR NATIONAL اور THE SOCIETE GENERALE D'ESCOMPTE میں ۱۹۳۰ء اور ۱۹۵۰ء میں مُلک کے تمام بینکوں میں جمع شدہ رقوم کا نصف حصہ جمع کیا گیا تھا۔ ۱۸۸۰ء اور ۱۹۱۴ء کے درمیانی عرصے میں ان بینکوں کے حصص کی قیمتوں میں دس گنا اضافہ ہوا۔ ۱۸۸۰ء میں ان بینکوں میں جمع شدہ رقم ۵۸ کروڑ گولڈ فرانک تھی لیکن ۱۹۱۴ء میں یہ رقم دو ارب پچیس کروڑ ۲۰ لاکھ فرانک اور ۱۹۳۰ء میں سات ارب ۱۲ کروڑ ۵۰ لاکھ

BUSINESS FLUCTUATIONS میں تجارت کے مالیاتی پہلو پر مکمل بحث کا شاندار خلاصہ پیش کیا ہے۔ ۹۹۔ سید قطب نے SOCIAL JUSTICE IN ISLAM میں چند ریاضی دانوں کی شہادتوں کی بنیاد پر اس نکتہ پر روشنی ڈالی ہے۔

گولڈ فرانک ہوگئی۔ فرانس کی حکومتیں کوشش کے باوجود ان بنکوں کا اثر ختم نہیں کر سکیں اور ۱۹۵۰ء میں حکومت نے ان بنکوں کو قومی ملکیت میں لے لیا۔

برطانیہ میں ملک کے مالی وسائل صرف پانچ بنکوں کے ہاتھ میں ہیں۔ ۱۹۰۰ء میں ان بنکوں میں ملک کی کل جمع شدہ رقوم کا ۲۷ فیصد، ۱۹۱۳ء میں ۳۹٫۷ فیصد ۱۹۲۰ء میں ۴۲٫۲ فیصد اور ۱۹۵۳ء میں ۷۹ فیصد حصہ جمع تھا۔

جرمنی میں ۱۹۴۳ء میں چھ بنکوں میں ملک کی کل جمع شدہ رقوم کا ۲۰٫۹ فیصد حصہ جمع تھا۔ ۱۹۵۶ء میں صرف تین بنکوں میں پورے ملک کی جمع شدہ رقوم کا ۵۵ فیصد حصہ جمع تھا۔ جاپان میں ۱۹۵۳ء میں پانچ بڑے بنکوں کے پاس کل جمع شدہ رقوم کا ۳۵ فیصد حصہ جمع تھا۔*

امریکہ میں ۱۹۴۵ء میں اگرچہ بنکوں کی تعداد ۱۴۰۰۰ تھی تاہم صرف چالیس بنکوں کا سرمایہ پچاس لاکھ ڈالر سے زیادہ تھا اور ان میں جمع شدہ رقم پورے ملک میں بنکوں میں جمع شدہ رقوم کا پچاس فیصد تھی۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد نہ صرف چند بنکوں کے ہاتھ میں اقتصادی قوت کا ارتکاز ہوا بلکہ انہوں نے بین الاقوامی اثر و رسوخ میں بھی اضافہ کیا جس سے دنیا بھر میں ان بنکوں کا جال بچھ گیا اور یوں وہ جگہ جگہ اقتصادی اور سیاسی اعتبار سے اثر انداز ہوتے رہے ہیں۔

AMERICAN BUSINESS FORTUNE کے ایک مضمون میں کہا گیا ہے:۔

"امریکہ میں بنکاری کی ترقی کا سب سے بڑا علاقہ خود امریکہ میں نہیں بلکہ سمندر پار کے

---

* یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ ۱۹۴۵ء میں جاپان کے آٹھ بنکوں میں جمع شدہ رقم پورے ملک میں جمع شدہ رقوم کا ۶۲ فیصد تھی۔ جنگِ عظیم کے بعد امریکی انتظامیہ نے اس اجارہ داری کو ختم کرنے کی کوشش کی اور یہ تناسب کم ہو کر دس فیصد رہ گیا مگر پھر اس میں اضافہ ہو گیا۔

ملکوں میں ہے...... سمندر پار کے ملکوں میں بنکاری کی ترقی سے حقیقی معنوں میں بنکوں کے پہلے بین الاقوامی نظام کی تشکیل ہو رہی ہے"۔ ۴

بنکوں کی تعداد میں یہ اضافہ صرف اقتصادی اسباب کی بناء پر نہیں بلکہ اس کے چند سیاسی اسباب بھی ہیں۔ BROWN BROTHERS HARRIMAN & CO کی ایک رپورٹ میں کہا گیا ہے "سیاسی اعتبار سے امریکہ دُنیا کے ہر گوشے میں اہم مفادات رکھتا ہے۔ یہ کوئی غیر فطری امر نہیں کہ ان علاقوں میں امریکہ کے تجارتی مفادات کو تقویت پہنچے بلکہ اس مقصد کے لئے متعلقہ ملکوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے"۔ ۵ پسماندہ ملکوں میں ہر شخص کو بخوبی علم ہے کہ وہاں امریکی بنکوں کے قیام کا مقصد یہ ہے کہ وہ امریکی امداد کے کھاتے میں کاروبار کی دیکھ بھال کر سکیں۔ ایسی مثالیں موجود ہیں کہ پسماندہ ملکوں کی حکومتوں پر دباؤ ڈالا گیا کہ وہ اپنے سرکاری بنکوں سے وافر رقم ان امریکی بنکوں میں منتقل کریں۔* ۱۹۱۸ء میں سولہ بیرونی ملکوں میں امریکی بنک (۶۱ شاخیں) کام کر رہے تھے۔ ان میں سے دس لاطینی امریکہ میں، پانچ یوروپ میں اور افریقہ، مشرق قریب اور مشرق بعید میں صرف ایک امریکی بنک تھا۔ ۱۹۵۰ء میں ۲۴ بیرونی ملکوں میں امریکی بنک تھے۔ (۹۵ شاخیں)۔ ان میں سے لاطینی امریکہ میں دس، یوروپ میں چار اور مشرق بعید میں سات بنک کام کر رہے تھے۔ ۱۹۵۰ء میں افریقہ اور مشرق قریب میں کوئی

---

۴ THE FIRST REAL INTERNATIONAL BANKERS

از JEREMY MAIN مطبوعہ FORTUNE دسمبر ۱۹۶۷ء صفحہ ۱۴۳

۵ "EDGE ACT" AND UNITED STATES INTERNATIONAL BANKING AND FINANCE از T.M. FARLEY مطبوعہ ۱۹۶۲ء صفحہ ۳۳

* ویت نام کے سلسلے میں ملاحظہ کیجئے BUSINESS WEEK ۱۴ اکتوبر ۱۹۶۷ء صفحہ ۹۲ پاکستان کے سلسلے میں THE USE OF AGRICULTURAL

(باقی برصفحہ آئندہ)

امریکی بنک نہیں تھا مگر ۱۹۶۷ء میں ۵۵ بیرونی ملکوں میں امریکی بنک موجود تھے اور ان میں امریکی بنکوں کی شاخوں کی تعداد ۲۹۸ تک پہنچ گئی تھی۔ امریکی بنکوں کے بین الاقوامی نظام میں اب تمام علاقوں کو شامل کر لیا گیا ہے۔ غیر ملکی بنکوں کے کاروبار نے ان ملکوں کے عوام اور حکومتوں کے لئے نئی پابندیاں لگا دی ہیں۔

صرف بنکاروں کے براہ راست اثر و رسوخ ہی سے معیشت درہم برہم نہیں ہو رہی ہے بلکہ یہ بنک سرمایہ کاروں کی پالیسیوں اور پروگراموں پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرتے ہیں اور جب پسماندہ ملکوں اور وہاں کی حکومتوں کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں تو ان کی پشت پناہی کے سبب اجارہ داریوں کو فروغ ملتا ہے اور ان کے ذریعے اقتصادی آمریت قائم ہو جاتی ہے۔ ذیل میں ہم چند مثالوں کے ذریعے یہ ظاہر کریں گے کہ سود اور بنکاری کے پردے میں کیا کھیل کھیلا جا رہا ہے:۔

مثال کے طور پر جرمنی میں بیسویں صدی کے آغاز سے چھ بڑے بنکوں کے سربراہ ۳۴۴ بڑے صنعتی اداروں کے ڈائرکٹروں کے بورڈ کے رکن تھے۔ بنک خود کو تجارت و صنعت پر مسلط کرنے کے بعد صنعتی اداروں کے داخلی معاملوں میں بڑی ڈھٹائی سے مداخلت کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہم ایک مکتوب کا حوالہ دیں گے جو ایک بڑے بنک نے جرمنی کے صنعتی ادارے

بقیہ حاشیہ۔

SURPLUS COMMODITIES FOR ECONOMIC DEVELOPMENT IN PAKISTAN از ڈاکٹر CHRISTOPHER BERINGER اور ارشاد احمد مطبوعہ کراچی ۱۹۶۳ء صفحہ ۱۴

++ یہ اعداد و شمار فیڈرل ریزرو بورڈ کی سالانہ رپورٹوں اور ANNUAL REPORTS AND OVERSEAS BRANCHES OF CORPORATION ENGAGED IN FOREIGN BANKING AND FINANCING IN OPERATION ON DECEMBER 31, 1967 پر مبنی ہیں۔

ZENTRALES NORDWESTDENTSCHES ZEMETSYN-DIKAT کے
ڈائرکٹروں کے بورڈ کو تحریر کیا تھا!

"آپ نے ماہ رواں کی ۱۸ تاریخ کو REICHSANZEIGER میں جو اعلان جاری کیا تھا اس کے مطالعے سے ہم یہ توقع کرتے ہیں کہ اپنی کمپنی کے اگلے عام اجلاس میں آپ اپنی فرموں میں ایسی تبدیلیاں کریں گے جو ہمارے لئے ناقابل قبول ہوں گی۔ بنا بریں ہم نہایت افسوس کے ساتھ آپ کو اطلاع دیتے ہیں کہ ہم فوری طور پر آپ کو فراہم کردہ قرضے منسوخ کرتے ہیں ـــ تاہم عام اجلاس میں اگر یہ ناقابل قبول فیصلے منظور نہ کئے جائیں اور بشرطیکہ اس سلسلے میں ہمیں ٹھوس ضمانت مہیا کی جائے، ہم آپ کے ساتھ نئے قرضوں کی بات چیت شروع کرنے کو تیار ہونگے۔"[۲۵]

بڑے بنک نہ صرف مقروض صنعتی و تجارتی اداروں کی پالیسیوں میں مداخلت کرتے ہیں بلکہ انہیں اس بات پر بھی مجبور کرتے ہیں کہ وہ عملے کے انتخاب میں ان کی پسند کو ملحوظ رکھیں۔ ان بنکوں نے صنعت و تجارت کے میدان میں مقابلے میں اضافے، چھوٹے چھوٹے اداروں کو ایک بڑے ادارے میں ضم ہو جانے اور اجارہ داریوں کے فروغ میں ایک فیصلہ کن کردار ادا کیا ہے۔ امریکہ میں بنکوں کی بے جا مداخلت کے سبب اجارہ داری کو تقویت پہنچی ہے۔
STOCKING AND WATKINS نے (MONOPOLY AND FREE ENTERPRISE صفحہ ۳۰) میں لکھا ہے "اگرچہ ۱۸۹۰ء سے پہلے صنعت کاروں نے بیشتر اداروں کے انضمام کے خود فیصلے کئے تھے لیکن جلد ہی بنکاروں اور سرمایہ داروں نے آگے بڑھ کر اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور PROMOTER بن بیٹھے۔ اُن کی حوصلہ افزائی اور اشارے پر انیسویں صدی کے آخر میں انضمام کی تحریک اپنے عروج پر پہنچ گئی۔"
ذیل میں ہم امریکہ کے وزیر داخلہ MR. CHAPMAN اور اجارہ داریوں کے بارے میں

---

۲۵ GELD-UND BANKWESEN از STILLICH صفحہ ۱۴۷

ایوان نمائندگان کی تحقیقاتی سب کمیٹی کے چیئرمین مسٹر CELLIS کا ایک مکالمہ درج کرتے ہیں۔ نئے تجارتی اداروں کے امکانات پر گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے کہا:۔

MR. CELLIS ۔" اگر ان مالیاتی اداروں کا موجودہ کمپنیوں سے کوئی رابطہ یا تعلق ہے تو وہ غالباً نئی کمپنیاں قائم نہیں کریں گے۔"

MR. CHAPMAN ۔" ظاہر ہے اس صورت میں نئی کمپنیاں قائم ہونے میں اُن کا کوئی مفاد نہیں اور ابھی تک انہوں نے ایسا نہیں کیا ہے۔" ۵۵

تجارت میں بنکوں کی مداخلت ایک ایسی حقیقت ہے جس سے چند ہی لوگ اختلاف کر سکتے ہیں ۵۶

یہ مداخلت صرف تجارت وصنعت تک ہی محدود نہیں بلکہ اقوام کے سیاسی معاملات میں بھی مداخلت کی کوششیں کی گئی ہیں۔ اگرچہ ابھی تک بین الاقوامی مالیات کا کوئی سیاسی تجزیہ نہیں کیا گیا ہے تاہم اس سلسلے میں جو حقائق منظر عام پر آچکے ہیں وہ ہماری آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی ہیں۔ کیلیفورنیا یونیورسٹی کے پروفیسر DAVID S. LANDES نے بین الاقوامی مالیات اور مصر میں اقتصادی سامراج کے موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اس امر پر روشنی ڈالی ہے کہ مصر میں سفارتی دباؤ اور سامراجی تسلط کے ذریعے کس طرح غیر ملکی سرمایہ ملکی معیشت کو متاثر کر رہا ہے۔ *

"حقیقت یہ ہے کہ غیر ملکی، خواہ اُن کو کتنا ہی بُرا بھلا کیوں نہ کہا جائے، مصر کے لئے

۵۵۔ HEARINGS BEFORE THE SUB-COMMITTEE ON STUDY OF MONOPOLY POWER مرتبہ STEEL صفحہ ۸۱۔

۵۶۔ مثال کے طور پر بنک آف اٹلی کی "مستعدی" ملاحظہ کیجئے BIOGRAPHY OF A BANK از M. AND B. R. JAMES صفحہ ۲۵۱

* ملاحظہ کیجئے BANKERS AND PASHAS از D. S. LANDES

ناگزیر تھے۔ مصر میں سرمایہ کاروں، صنعت کاروں، یا انجینئروں کا فقدان تھا جس کی وجہ سے ملک میں صنعتی انقلاب لانا ممکن نہ تھا۔ اس کے علاوہ وہاں ایسی اقدار بھی موجود نہ تھیں جو تاجروں اور کاریگروں کے لئے ممد و معاون ہوتیں۔ سرمایہ اور ہنر صرف یورپی باشندوں کے پاس تھا جو مغربی تہذیب کے نیج ہو سکتے تھے۔ یورپی باشندے اس حقیقت سے باخبر تھے اور یوں وہ ہاتھ آجانے والے ایک پیسے کو بھی چھوڑنے پر تیار نہ تھے۔"

"مصر کی معیشت کی تباہی کا معاشرہ اور اقتصادیات کے مخصوص انداز سے گہرا تعلق تھا۔ حکومت، عوام کے بجائے فرد واحد کی نمائندگی کرتی تھی اور تقریباً تمام اختیارات وائسرائے اور اس کے خاندان کے ہاتھ میں تھے۔ سرکاری دفتروں کا کام عوام کی خدمت کے بجائے یہ تھا کہ وہ دونوں ہاتھوں سے لوٹ کھسوٹ کریں۔ عہدوں کی تقسیم میں کسی قابلیت و استحقاق کو دخل نہ تھا بلکہ خاندانی پس منظر کی بنیاد پر عہدے تقسیم کئے جاتے۔

"نتیجتاً نہر سوئیز کی تعمیر ہو کر عام کاروبار کہیں تو وائسرائے کے بچپن کے دوست کو نوازا جاتا اور کہیں وزیروں کے ساتھ میل جول رکھنے والوں کو۔ انتظامیہ کے حکام سے میل جول رکھنے والوں اور انہیں نذرانے پیش کرنے والوں کو کسی کام میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی تھی۔ ملک میں ہر سطح پر رشوت عام تھی۔" اُس زمانے میں اسمٰعیل پاشا مصر کا فرمانروا تھا۔ اُس کے بارے میں پروفیسر **LANDES** کا کہنا ہے کہ

"پہلے خدیو حکمراں کی حیثیت سے اسمٰعیل پاشا کا کردار تاریخ میں ایک ناقابلِ فراموش باب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی تخت نشینی کے بعد تیرہ سال کے عرصے میں مصر کے قومی قرضے کی رقم ۳۳ لاکھ پونڈ سے بڑھ کر نو کروڑ دس لاکھ پونڈ تک پہنچ گئی۔ ۱۸۷۶ء میں مصر دیوالیہ ہو چکا تھا اور اب غیر ملکی اقتدار و تسلط کا راستہ ہموار تھا۔"

یہ تو تھے حقائق۔ باقی رہے اسباب و ذمہ داریاں تو ان کے سلسلے میں کافی اختلافِ رائے موجود ہے۔

"مورخین نے اسے اچھے نام سے یاد نہیں کیا ہے۔ اُس نے جب زمام حکومت سنبھالی تو ملک میں خوشحالی کا دَور دورہ تھا اور اس کے آخری ایّام میں ہر طرف افلاس و فلاکت کے سائے پھیلے ہوئے تھے۔ اسمٰعیل خدیو پاشا ایک اولوالعزم فرمانروا تھا مگر اس کی شخصیت کے دوسرے پہلو بالکل تاریک تھے۔ دوسرے لوگوں کے نزدیک وہ ایک عظیم المرتبت حکمران، ایک مدبر اور دور بین انسان تھا جو اپنے عوام کو زیادہ سے زیادہ خوش حال دیکھنا چاہتا تھا جس نے اگر قرضے لئے تو صرف اس لئے کہ عوام کے حالات بہتر ہو سکیں۔ وہ مصر میں رفاہ عامہ کے لئے تعمیرات چاہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ ملک میں ریلوں کا جال بچھا دیا جائے اور اسکندریہ اور قاہرہ کو دُنیا کے خوبصورت شہروں میں شمار کے قابل بنا دیا جائے۔ ان لوگوں کے خیال میں اسمٰعیل پاشا نے جو بے تحاشا قرضے لئے ان کا سبب خود اس کی ذات نہیں تھی بلکہ وہ چند ناعاقبت اندیش لوگوں میں گھرا ہوا تھا۔ اس کی زندگی ہی میں مصر پر غیر ملکی تسلط قائم ہو چکا تھا اور مصر کی معیشت سے صرف غیر ملکی تمسکات کے مالکوں کو فائدہ پہنچ رہا تھا۔"

مصر کے تمام آلام و مصائب کا سبب بین الاقوامی مالیاتی پالیسی تھی۔ یہی حال پولینڈ اور چند دوسرے ملکوں کا تھا۔* قرضوں کے سیاسی خطرات کسی طرح بھی اقتصادی خطرات سے کم نہیں۔ آج جو پسماندہ ممالک تمام بڑی طاقتوں سے قرضے لے رہے ہیں، اب بھی موقع ہے کہ وہ ان دُور رس نتائج و خطرات کا جائزہ لیں۔ ایک خاص مرحلے کے بعد مالی شرائط سیاسی زنجیروں میں تبدیل ہو جاتی ہیں اور غلامی و محکومی کی ایک نئی شکل ظہور میں آتی ہے۔ؔ یہ سب کچھ

---

* پولینڈ کے سانحے کے لئے ملاحظہ کیجئے: CREDIT AND PEACE: A WAY OUT OF THE CRISES از پروفیسر FELIKS MLYNARSKI اور ڈاکٹر انور اقبال قریشی کی تصنیف OP-LIT باب ششم۔

ؔ۔ قرضوں اور سود سے بین الاقوامی استحصال کے مقاصد کس طرح پورے کئے جاتے ہیں؟ اس سلسلے میں THE PROTOCOLS OF THE LEARNED ELDERS OF ZION کے چند اقتباسات کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

سود کی بنیاد پر بین الاقوامی قرضوں کا نتیجہ ہوا کرتا ہے۔

(۵) بین الاقوامی سودی قرضوں کے ایک اور پہلو پر بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اگرچہ دُنیا کے غریب ملکوں کو یہ قرضے امداد کے نام سے دیئے جاتے ہیں مگر حقیقت میں یہ استحصال کا ایک اچھوتا طریقہ ہے۔ یہ قرضے نہ صرف سیاسی مقاصد کے لیئے استعمال ہوتے ہیں بلکہ اقتصادی نقطۂ نظر سے بھی ان سے متعلقہ ملک کو نقصان پہنچتا ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ ان قرضوں پر سود کی شرح بہت زیادہ ہوتی ہے اور ان قرضوں کی واپسی اور متعلقہ اخراجات کسی غریب ملک کی معیشت کے لیئے ایک بھاری بوجھ ہے۔ یہ قرضے عموماً مشروط قرضے ہوتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ نام نہاد امداد سے "امداد دینے والے ملک سے مال منگایا جاتا ہے۔ خواہ اس مال کی قیمت دوسرے ملکوں سے کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو اور مال گھٹیا ہی کیوں نہ ہو۔ امداد کے ساتھ ساتھ ماہرین کی ایک فوج بھی آتی ہے جو غریب ملکوں کے حالات سے بالکل ناواقف ہونے کے باوجود بھاری تنخواہیں وصول کرتے ہیں اور جن کی موجودگی سے اُس ملک کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ پسماندہ اور غریب ملکوں کو مخصوص مقاصد کے پیش نظر قرضے دیئے جاتے ہیں جس سے ان ملکوں میں سرمایہ کاری کا نظام اور ترجیحات کا بندوبست درہم برہم ہو جاتا ہے۔[۲۳] یہ سب سودی قرضوں کے گھناؤنے پہلو ہیں اور یہ لعنت بین الاقوامی قرضوں کے ساتھ وابستہ ہے۔ چونکہ ہم سود کے کاروبار کا جائزہ لے رہے ہیں بنا بریں ہم اپنا مطالعہ پسماندہ ملکوں میں ان قرضوں سے پیدا ہونے والے اقتصادی نقصانات تک محدود رکھیں گے۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ شائع شدہ اعداد و شمار کے مطابق صرف ایک ملک یعنی امریکہ نے یکم جولائی ۱۹۴۵ء سے ۳۰ جون ۱۹۶۷ء تک ۱۱۷ ارب ۴۰ کروڑ ڈالر کی اقتصادی یا فوجی امداد مختلف ملکوں کو دی ہے۔ اس میں سے ۵۹ ارب ستر کروڑ ڈالر کی

امداد ترقی یافتہ ملکوں کو، ۳۶ ارب ۹۰ کروڑ ڈالر کی امداد "دوست" ملکوں کو (ایسے ممالک جہاں امریکہ کے اہم فوجی مفادات ہیں۔ یہ ممالک یونان، ایران، ترکی، ویت نام، فارموسا، کوریا، فلپائن، تھائی لینڈ، اسپین، پرتگال اور لاؤس ہیں) اور ۴۲ ارب ۶۰ کروڑ ڈالر کی امداد دُنیا کے باقی تمام پسماندہ ملکوں کو دی گئی۔ اہم نکتہ یہ ہے کہ ترقی یافتہ اور "دوست" ملکوں کو جو امداد دی گئی بالترتیب اس کا ۷۳ فیصد اور ۸۷ فیصد حصّہ امدادی رقوم کے طور پر تھا جبکہ پسماندہ ملکوں کے لئے امدادی رقوم کا تناسب صرف ۴۲ فیصد تھا؎ ان ملکوں کو ملنے والی "امداد" کا ۵۸ فیصد حصّہ سودی قرضوں کی شکل میں ہے جو یہ ممالک اپنے زرِ مبادلہ کے محدود وسائل سے ادا کریں گے۔ ان قرضوں کا آغاز ہوئے ایک عرصہ ہوگیا ہے اور بیشتر پسماندہ ممالک قرضوں کی رقم کی ادائیگی کے سلسلے میں گوناگوں مشکلات کا شکار ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ پُرانے قرضوں کی ادائیگی کے لئے انہیں نئے قرضے لینے پر مجبور ہونا پڑتا ہے اور ان تمام مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہمیں اس امر کا بھی جائزہ لینا چاہیے کہ "امدادی" قرضوں سے امداد دینے والے اور امداد لینے والے ملکوں کی باہمی تجارت پر کیا اثر پڑا ہے۔

؎ یہاں ہم صرف ایک مثال پر اکتفا کریں گے۔ HERBERT FRIEDMAN نے انٹرنیشنل افیئرز لندن (اپریل ۱۹۶۷ء) میں "امداد یا سامراج" کے موضوع پر اپنے مقالے میں اس بات پر روشنی ڈالی ہے کہ کوئی شخص بھی کراچی میں درآمد شدہ کیمیاوی اجزا سے تیار ہونے والے مندرجہ ذیل مشروبات خرید سکتا ہے۔ ہل اپ، کنیڈا ڈرائی، اسٹیرا، کوکا کولا، ڈبل کولا، کولا کولا، فانٹا، ہوفمین مشن، پیپسی کولا، پیری کولا اور سیون اپ۔ اس کے ساتھ ساتھ کراچی میں سربند بوتلوں میں دودھ فراہم کرنے کے صرف تین کارخانے ہیں جن میں سے دو تجارتی نوعیت کے ہیں اور ایک ملٹری لمیٹڈ ہے مگر اس کا کاروبار بڑا محدود ہے۔" (صفحہ ۳۲۹)

تجارت کا بیشتر حصہ قرضے دینے والے بیرونی ملکوں کے مطالبات پورے کرنے میں کھپ جاتا ہے اور ان ملکوں کے نادار عوام کے لئے ہمدردی کے اظہار کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا۔ ان قرضوں سے ہماری اقتصادیات بے بس ہو گئی ہیں اور ان سے صرف قرضے دینے والے ملکوں کے مفادات پورے ہوتے ہیں۔ محتاط تخمینوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ پسماندہ ملکوں کو ہر سال تقریباً ساٹھ لاکھ ڈالر کا قرضہ مل رہا ہے اور وہ قرضوں کے سلسلے میں دیگر اخراجات اور سود کے طور پر ۳۶ لاکھ ڈالر سالانہ ادا کر رہے ہیں تفصیلی مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان قرضوں سے چونکہ ترقی یافتہ ملکوں سے مال خریدا جاتا ہے اور قرضے کی رقم سود کے ساتھ واپس کرنی ہوتی ہے، پسماندہ ملک چھ ارب ڈالر کے مال کے عوض نو ارب ساٹھ کروڑ ڈالر کی رقم ادا کرتے ہیں۔ اگر پسماندہ ملکوں کی برآمدی تجارت کا حجم کافی نہیں ہے تو انہیں واجبات کی ادائیگی کے لئے نئے قرضے لینے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ اس طرح پسماندہ ملک اقتصادی بدحالی کی جانب بڑھتے رہتے ہیں [۵]

---

۵ ہم پہلے ہی اس امر پر روشنی ڈال چکے ہیں کہ سوشلسٹ ملک بھی بین الاقوامی قرضوں پر سود لیتے ہیں۔ سوشلسٹ ممالک قرضوں کے لین دین میں کسی طرح بھی سرمایہ دار ممالک سے مختلف نہیں لیکن اس سلسلے میں ایک پہلو قابلِ توجہ ہے۔ مال کے بدلے مال کے سمجھوتوں کے تحت سوشلسٹ ممالک سے ملنے والے قرضوں کی ادائیگی مال کی برآمدات سے کی جاتی ہے کئی مواقع پر روس نے کسی ملک سے تبادلۂ اجناس کے سمجھوتے کے تحت خریدا ہوا مال بین الاقوامی منڈی میں کم داموں فروخت کر کے اس مال کے لئے متعلقہ ملک کی بین الاقوامی ساکھ تباہ کر دی۔ مصر کی کپاس اور پسماندہ ملکوں کی کھوپرے، میوہ، اونٹ کی کھال اور تربوز کے بیج وغیرہ کی تجارت کے سلسلے میں روس نے یہی کارروائی کی ہے۔ یہ کارروائی ترقی پذیر ملکوں کی برآمدات کے لئے انتہائی ضرر رساں ثابت ہوئی ہے۔

(ملاحظہ کیجئے:۔

THE PATTERN OF SOVIET MILLITARY AID

از EUGENE HINTERHOFF مطبوعہ THE TABLET

۲۴ نومبر ۱۹۶۲ء صفحہ ۱۱۲۶)

اس باب میں ہم نے بنی نوع انسان اور معاشرے کے لیے سود کے نقصانات پر روشنی ڈالی ہے۔ لازم ہے کہ ہم حالات کا بخوبی تجزیہ کریں اور اس بین الاقوامی استحصال کا خاتمہ کر دیں۔ سود کا ایک اور پہلو بھی ہے جس پر لوگوں نے توجہ نہیں کی ہے۔ ضروری ہے کہ اس پہلو پر بھی روشنی ڈالی جائے۔ قرآن حکیم کے ارشادات کے مطابق سود، انسانی معاشرے کی بہت سی خرابیوں کی بنیاد ہے کیونکہ قرآنی الفاظ میں یہ "ظلم" ہے (یعنی استحصال اور جبر)۔ اس سلسلے میں قرآن میں کہا گیا ہے "اور اگر تم باز نہیں آئے (سود کے لین دین سے) تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے جنگ کیلئے تیار ہو جاؤ" [۵] قرآنی احکامات کی رو سے یہ انتہائی واضح تنبیہ ہے۔ اس کا دائرہ کافی وسیع ہے اور مفسروں نے اس کی وضاحت کے ساتھ تفسیر بیان کی ہے۔ سود کا لین دین کرنے والوں کو نہ صرف اس دنیا میں بلکہ آخرت میں بھی عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا۔ ان تمام باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ بات کس قدر سچ ہے کہ خود ہمارے زمانے میں جنگ اور ہتھیاروں کی دوڑ، سود اور سود کی بنیاد پر قائم ہونے والی معیشت سے کتنا گہرا تعلق ہے۔ جنگ اور جنگی تیاریاں، اللہ تعالیٰ کی تنبیہ کی ایک شکل ہیں کیونکہ جنگ سے معاشرے کی تباہی و بربادی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اللہ نے حضرت موسیٰؑ کی حکم عدولی کرنے والوں کو یہ سزا دی تھی کہ وہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے تھے اور آپس میں برسرپیکار ہو گئے۔ [۶]

سود کی بنیاد پر قائم ہونے والا معاشرہ خدا کے احکامات کے سراسر خلاف ہے۔ اور صحیح معنوں میں اس معاشرے کے افراد ایک دوسرے کا گلا گھونٹنے کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں، خواہ یہ کوششیں محدود ہوں یا لامحدود ان سے انسانیت کے لیے فلاح کا کوئی راستہ باقی نہیں رہا ہے۔ اس موضوع پر اگر مزید مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ

۵۔ قرآن۔ دوم ص ۲۷۹

۶۔ قرآن۔ دوم ص ۵۴۔ انجیل مقدس کے حوالے کے لیے ملاحظہ کیجیے خروج (EXODUS) ۳۲ صفحات ۲۶ تا ۲۸

خدا نے قرآن میں جو تنبیہہ کی ہے وہ حقیقت سے کتنی قریب ہے اور خدا کی نافرمانی کرنے والے کتنے سخت عذاب سے دوچار ہیں۔

یہ بات کسی شک و شبہ کے بغیر ثابت کی جا سکتی ہے کہ بیسویں صدی کی دونوں عالمی جنگوں کے پس پشت اقتصادی مقاصد کارفرما تھے۔ سیاسی نظام کی ناکامی، ہوس ملک گیری، عالمی اقتدار کی خواہش اور اقتصادی عناصر، مغربی ملکوں کی سودی معیشت کا نتیجہ تھے اور یہی وہ اہم اسباب تھے جن کی وجہ سے وہ ہیبت ناک جنگیں پوری انسانیت کو ناقابل بیان مصائب کا نشانہ بنا گئیں۔ مغربی تہذیب میں جنگ اور معیشت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ معیشت کی بقا کے لئے جنگ لازمی ہے اور جنگ کے لئے ضروری وسائل معیشت مہیا کرتی ہے۔ ANTHONY HARRISON کا کہنا ہے کہ "بیسویں صدی تک اقتصادی اعتبار سے یہ کوشش ہوتی رہی ہے کہ عالمی جنگ چھڑ جائے اور جنگ چھڑنے کیلئے ضروری تھا کہ معیشت کے تمام وسیلوں کا رخ اسی سمت میں موڑ دیا جائے"۔*

مغربی ممالک کی اقتصادی قوت کا اہم ستون ہتھیاروں کی پیداوار اور جنگی تیاری ہے۔ ان ملکوں کی ساکھ ہتھیاروں کی پیداوار و تجارت کے دم سے ہے۔ ان کی خوش حالی کے لئے ضروری ہے کہ دنیا میں جنگ کے شعلوں کو ہوا ملتی رہے اور انسانیت اس آگ میں بھسم ہوتی رہے۔ داخلی حالات کے دباؤ کے سبب وہ اس آگ سے دور بھی نہیں رہ سکتے۔ ایک قدیم یونانی کہاوت ہے کہ تم اپنے ہتھیاروں کی موجودگی میں بے کار نہیں بیٹھ سکتے۔ جنگ ہوتی ہے اور اس سے انسان کو ناقابل بیان آلام و مصائب کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ جنگ میں زیادہ سے زیادہ ہتھیاروں کی ضرورت ہوتی ہے اور یوں ہتھیاروں کی تجارت دن دوگنی رات چوگنی ترقی کرتی جاتی ہے۔ یہ افسوسناک طریقہ کار ہے لیکن سود کی

---

* از انتھونی THE FRAMEWORK OF ECONOMIC ACTIVITY ہیریسن مطبوعہ ۱۹۶۸ء میکملن اینڈ کمپنی۔ ملاحظہ کیجئے "بیسویں صدی کا آغاز" صفحہ ۳۶۔

بُنیاد پر قائم ہونے والی معیشت ایسے ہی طریقوں سے داخلی اور خارجی طور پر انسان کو برسرِ پیکار رکھتی ہے۔ علاوہ ازیں جنگ کی مختلف اقسام ہیں کہیں تو یہ مقامی جنگ، طبقہ واری کشمکش، فرقہ وارانہ چپقلش، قبائلی لڑائی، علاقائی جنگ اور قومی رنگ کا روپ اختیار کرتی ہے اور کہیں بین الاقوامی جنگ کی صورت میں دُنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے اور اس کا نتیجہ تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں*۔ حقیقت یہ ہے کہ:

" ۱۹۴۵ء کے بعد ۲۴ سال کے عرصے میں دُنیا بھر میں ۵۵ اہم لڑائیاں ہوئیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر پانچ مہینے بعد دُنیا میں کسی نہ کسی جگہ انسانوں کا خون پانی کی طرح بہتا رہا اور آگ کے شعلے بھڑکتے رہے۔ ان میں سے ہر لڑائی، اپنی نوعیت اور شدت کے اعتبار سے کسی وقت بھی ساری دُنیا کو اپنی لپیٹ میں لے سکتی تھی۔ اگر اس تعداد میں حکومتوں کا تختہ اُلٹنے، بڑے پیمانے پر فسادات اور مختلف گروہوں کی طرف سے کشت و خون کے واقعات کو بھی شامل کر لیا جائے تو تاریخ کے دھارے پر اہم اثر ثبت کرنے والے واقعات کی تعداد تین سو سے تجاوز کر جاتی ہے یعنی اوسطاً ہر مہینے کشت و خون کا ایک واقعہ رونما ہوا۔ٌ"

غرضیکہ جنگ ہماری زندگی کا ایک عام واقعہ بن گئی ہے۔ اس سے انسانیت کو جو مہیب خطرات درپیش ہیں وہ ہر شخص کے علم میں ہیں۔ ہر روز بے گناہ انسانوں کا خون بہہ رہا ہے اور دُنیا بھر میں تباہی و بربادی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ سب کچھ سرمایہ داروں کے عظیم مفاد کے سبب ہو رہا ہے۔ سود کے سہارے قائم ہونے والی معیشت کی " ترقی" اور "نشوونما" کے لئے بڑے پیمانے پر انسانی خون کی ارزانی اور مادی نقصانات ضروری ہیں۔ اس "ترقی یافتہ" اور "مہذب" دُنیا میں چند لوگوں کی خوشحالی اور مفاد کے لئے اگر انسانوں

---

* JOHN BRIGHT

ٌ THE WAR BUSINESS از GEORGE THAYER صفحہ ۱۷

کا جان و مال بھینٹ چڑھتا ہے تو کیا ہوا، ایک گروہ کا مفاد تو محفوظ ہے۔

ممکن ہے کہ کچھ لوگوں کو ہمارے دعوے سے کلی طور پر اتفاق نہ ہو اور اُن کا خیال ہو کہ ہم نے حالات و واقعات کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے ذیل میں ہم چند حقائق پیش کرتے ہیں جو ہمارے اس دعوے کی تائید کرتے ہیں کہ نام نہاد دستوں نے کس طرح ہمیں استحصال کا نشانہ بنا رکھا ہے:۔

ہتھیاروں کی تجارت موجودہ زمانے کا ایک اہم پہلو ہے۔ اس سلسلے میں ہم GEORGE THAYER کے معرکۃ الآرا جائزے کے چند اقتباسات پیش کرتے ہیں:۔

"ہتھیاروں کی تجارت کی سالانہ مالیت اس وقت اندازاً ۵ ارب ڈالر ہے۔ ۱۹۳۶ء میں دُنیا کے تمام ملکوں نے اپنے دفاع پر جو رقم خرچ کی تھی، یہ اُس سے کہیں زیادہ ہے۔ ۱۹۴۵ء کے بعد سے غیر کمیونسٹ ملکوں نے دوسرے ملکوں کو امداد اور دیگر صورتوں میں جو رقم دی تھی وہ اندازاً ۵۹ ارب ڈالر تھی۔ اس میں سے امریکہ نے تقریباً ۵۰ ارب کی امداد دیگر ممالک کو دی۔ برطانیہ نے اندازاً ۵ ارب ڈالر اور فرانس نے تین ارب ڈالر کی فوجی اور غیر فوجی امداد دی۔ اس کے علاوہ روس چین اور دوسرے کمیونسٹ ملکوں نے اسی عرصے میں غیر کمیونسٹ ملکوں کو سات ارب ڈالر کی امداد مہیا کی۔*

"اگر ہم ۱۹۴۵ء کے بعد سے بڑی صنعتی یا کاروباری اداروں کی جانب سے امداد کے طور پر اور قیمتاً دیے جانے والے ہتھیاروں کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ ہتھیاروں کی فراہمی میں اضافے کے ساتھ ساتھ دُنیا میں کشت و خون میں بھی اضافہ ہوا۔ اس سے کم از کم ایک

---

* روس اور چین کی امداد میں کمیونسٹ ملکوں کو ملنے والی امداد شامل نہیں ہے۔ ان ملکوں کیلئے روسی اور چینی امداد کے تصدیق شدہ اعداد و شمار دستیاب نہیں ہیں لیکن یہ امداد کسی صورت میں بھی غیر کمیونسٹ ملکوں کو ملنے والی امداد سے کم نہیں ہو سکتی۔ یہ ہتھیاروں کی دوڑ کا تقاضا ہے اور اس کے پس پُشت یہ نظریہ کارفرما ہے کہ کمیونسٹ ملکوں میں طاقت کا توازن برقرار رکھا جائے۔

نتیجے پر پہنچا جا سکتا ہے۔ یعنی ہتھیاروں کی فراہمی میں اضافہ سے اُن کے استعمال میں بھی اضافہ ہوا۔**

اس وقت انسان شعلوں میں گھرا ہوا ہے اور صنعتی اعتبار سے ہر ترقی یافتہ ملک ان شعلوں کو بھڑکانے کے اسباب فراہم کر رہا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ دولت کما سکے۔ اس گندے کاروبار میں سرمایہ دار اور سوشلسٹ سب برابر کے شریک ہیں۔ "آج ہتھیاروں کی تجارت کا ایک افسوسناک پہلو یہ ہے کہ امریکہ جو ہتھیاروں میں کمی کا سب سے بڑا علمبردار ہے، ہتھیاروں کی فراہمی کا سب سے بڑا ذریعہ بھی ہے۔ ترقی پذیر ملک جنہیں اپنے اقتصادی حالات سنوارنے کے لئے مالی وسائل کی شدید ضرورت ہے، محض نمائش کے لئے ہتھیاروں کی خریداری پر یہ وسیلے ضائع کر رہے ہیں۔ مغربی جرمنی کے پاس اپنی ضرورت سے زیادہ ہتھیار موجود ہیں پھر بھی امریکہ اسے مزید ہتھیار خریدنے پر مجبور کرتا ہے۔ رُوس جو مساوات کا علمبردار ہے، جنوبی افریقہ کے ہاتھ فوجی ساز وسامان فروخت کر رہا ہے۔ چین جو ابھی داخلی طور پر بھی پوری طرح مستحکم نہیں ہے، افریقہ کے باغیوں کو ہتھیار فراہم کر رہا ہے۔ چیکوسلاویکیہ، پرانے سرمایہ داروں کے انداز میں مغربی ملکوں اور غیر جانبدار ملکوں کو ہتھیار دے رہا ہے۔ سویڈن اور سوئٹزرلینڈ کہنے کو تو غیر جانبدار ملک ہیں اور طویل عرصے سے جنگ کی لعنت سے محفوظ ہیں، دُنیا میں ہتھیار برآمد کرنے والے سب سے بڑے ملک ہیں[1]

** The War Business: The International Trade In Armaments از George Thayer مطبوعہ ۱۹۶۹ء صفحہ ۲۰-۱۹۔ اس سلسلے میں World Today لندن ستمبر ۱۹۶۶ء میں Geoffrey Kemp کے مقالے Arms Sales And Arms Control In The Developing Countries اور John L. Sutton اور Geoffrey Kemp کی تصنیف Arms To Developing Countries (۱۹۴۵-۶۶ء) Adelphi Paper No. 28 مطبوعہ Institute Of Strategic Studies لندن اکتوبر ۱۹۶۶ء کا مطالعہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

[1] The War Business صفحہ ۲۱

اس گھناؤنے کاروبار کا صرف یہی ایک پہلو قابلِ مذمت نہیں کہ کس ملک نے کس پیمانے پر ہتھیار فراہم کئے بلکہ اس کاروبار کے ہر پہلو کی جس قدر مذمت کی جائے کم ہے کیونکہ اس سے انسانیت کی فلاح تو کجا انسانیت کی تباہی و بربادی کا سامان ہو رہا ہے۔

THAYER نے چند پہلوؤں پر یوں روشنی ڈالی ہے!۔

"یوں کہنا کہ امریکہ نے پچھلے ۲۴ برس میں تقریباً پانچ ارب ڈالر کا اسلحہ دوسرے ملکوں کو دیا، شاید قابلِ توجہ نہ ہو۔ اس بات کو جب آپ ہتھیاروں کی تعداد میں ظاہر کریں تو اندازہ ہوگا کہ یہ معاملہ کس قدر سنگین ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سنہ ۱۹۵۰ء اور سنہ ۱۹۶۶ء کے درمیان امریکہ نے قیمتاً یا امداد کے طور پر ۹۳۰۰ جیٹ لڑاکا ہوائی جہاز، ۸۳۴۰ دوسرے ہوائی جہاز، ۲۴۹۶ سمندری جہاز، ۱۹۸۲۷ ٹینک، ۴۴۸۳۸۳ بکتر بند گاڑیاں، ۱۴۴۵۱۹۴ بندوقیں، ۲۱۵۲۷۹۳ رائفلیں، ۸۲۴۹۶ سب مشین گنیں، ۳۰۶۶۸ موٹر توپیں، ۲۵۱۰۶ توپیں (جن میں دُور مار توپیں بھی شامل ہیں) اور ہر قسم کے ۳۱۳۶۰ میزائل دیگر ممالک کو دیئے۔ اس کے علاوہ اس میں گولہ بارود کے اربوں راؤنڈ، ہزاروں کی تعداد میں دوسرا متعلقہ سامان مثلاً کمپیوٹر، ریڈیو سیٹ اور امریکہ اور امداد وصول کرنے والے ملکوں میں تربیتی مشقوں میں بے شمار وقت بھی شامل ہے۔

"ہتھیاروں کی فروخت اور امداد کے ذرائع میں اضافہ بھی ہو رہا ہے۔ مثلاً سنہ ۱۹۴۵ء سے سنہ ۱۹۵۵ء تک دُنیا میں فوجی ساز و سامان کی منڈی پر امریکہ اور برطانیہ کا قبضہ تھا۔ دونوں ملکوں نے امداد اور فروخت کی صورت میں تخمیناً بالترتیب ہر سال دو ارب اور چالیس کروڑ ڈالر کا فوجی سامان فروخت کیا۔ سنہ ۱۹۵۵ء میں روس بھی اس میدان میں داخل ہوگیا اور اندازاً پچاس کروڑ ڈالر سالانہ کا فوجی سامان دوسرے ملکوں کو فراہم کرنے لگا۔ جلد ہی فرانس بھی اس میدان میں کود پڑا اور چالیس کروڑ ڈالر سالانہ کا سامان دوسرے ممالک کو فراہم کر رہا ہے۔ حالات کی ستم ظریفی ہے کہ مارشل پلان کے تحت امریکی امداد کے بعد ہی فرانس اس میدان میں داخل ہوا ہے۔

"پچھلے سات برس میں مغربی جرمنی، چیکوسلاویکیہ، بلجیم، سوئیڈن، سوئٹزرلینڈ، اسرائیل، اٹلی، کنیڈا اور چین یکے بعد دیگرے اس میدان میں داخل ہو گئے اور ہر ملک کے پاس مختلف قسم کا سامان ہے ــــ آگے مرضی گاہک کی۔ ہتھیاروں کی فروخت وفراہمی میں تربیتی پروگرام اور فنی مشورے شامل ہیں۔ اس وقت دُنیا بھر میں ہتھیاروں کی تجارت کا اوسط پانچ ارب ڈالر سالانہ ہے۔ جبکہ دس برس پہلے یہ اوسط نصف تھا۔ اندازہ ہے کہ ۱۹۷۰ء کے آغاز تک یہ اوسط دس ارب ڈالر سالانہ تک پہنچ جائے گا"[۵۵]

جہاں تک ہتھیاروں بلکہ موت کے کاروبار کا تعلق ہے، اس میدان میں ہر ملک دوسرے ملک سے آگے نکل جانے کی کوشش کر رہا ہے۔ "جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ ایسے شخص کی طرح کھڑے ہوں گے جنھیں شیطان لپٹ کر پاگل بنا دے"[۵۶]

ہتھیاروں کی اس بین الاقوامی تجارت کے پس پشت بنیادی محرک، سودی معیشت کی ضرورتیں ہیں۔ امریکہ کے ایک ممتاز اقتصادی ماہر THORNSTEIN VEBLEN نے جنگ اور فوجی تنظیم کو "وحشیانہ مکتب فکر کا موثر ذریعہ اظہار" قرار دیا ہے تاہم اس امر کی وضاحت کی ہے کہ اس کے پس پردہ سرمایہ دارانہ ذہنیت اور تجارتی مصلحتیں کارفرما ہیں۔ تجارتی مفادات، ایک جارحانہ قومی پالیسی کا تقاضا کرتے ہیں اور تاجر اس پالیسی کو اپنے مفاد کے مطابق بروئے کار لاتا ہے۔ یہ پالیسی بیک وقت جنگی پالیسی بھی ہے اور قومی بھی"[++] اس پالیسی سے صرف تاجر طبقے کو کیا فوائد پہنچتے ہیں اس کے لئے ایک ہی مثال کافی ہوگی۔ ۱۹۵۱ء سے ۱۹۶۰ء کے دوران امریکی حکومت نے بوئنگ کمپنی کو BOMARC، بی باون[۵۲] اور بی چون[۵۳] بمبار،

---

۵۵ THE WAR BUSINESS صفحات ۳۹-۳۸

۵۶ قرآن۔ دوم ۲۷۵

++ THE THEORY OF BUSINESS ENTERPRISE از VEBLEN صفحات ۳۹۲ - ۳۹۱

KC-135 تیل بردار جہاز اور دوسرے منصوبوں کے لئے جو آرڈر دیئے تھے اُن کی مالیت گیارہ ارب ۸۰ کروڑ ڈالر تھی۔ جس سے بوئنگ کمپنی کو نو کروڑ ستر لاکھ ڈالر کا منافع ہوا۔ کمپنی کے ایک سابق اکاؤنٹنٹ نے سینیٹ کی سب کمیٹی کے اجلاس میں شہادت دیتے ہوئے بتایا کہ کمپنی کے اصل سرمایے پر ۱۹۵۱ء اور ۱۹۶۰ء کے دوران اس کے منافع کی شرح ۳۶ فیصد اور ۱۹۵۳ء میں منافع کی شرح ۱۰۸٫۰۶ فیصد تھی۔ ٹیکسوں کی ادائیگی سے قبل کمپنی کے منافع کی شرح ۴۷٫۳۸ فیصد، سرکاری ٹھیکوں پر ٹیکس کی ادائیگی کے بعد ۳۵٫۶۸ فیصد اور سرکاری اور تجارتی ٹھیکوں (مشترک) پر ٹیکسوں کی ادائیگی کے بعد منافع کی شرح ۱۹٫۰۵ فیصد تھی۔ یہ امریکہ میں بھاری صنعتوں کے اوسط خالص منافع سے دوگنی رقم ہے۔*

ہتھیاروں کی فراہمی میں قومی حکومتوں اور بین الاقوامی سودوں میں صرف بڑے تاجروں ہی کو فائدہ پہنچتا ہے۔ ان ہتھیاروں کی بڑی تعداد نجی شعبے سے حاصل کی جاتی ہے۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران امریکہ میں ۶۷٫۲ فیصد جنگی ٹھیکے (کُل رقم ایک ارب ۷۵ کروڑ ڈالر) سو بڑی کمپنیوں کو دیئے گئے جن کا بھاری صنعتوں سے تعلق تھا۔[۵] کوریا کی جنگ کے دوران فوجی تنظیم نو پر ۶ ارب ۳۰ کروڑ سے ۱۴ ارب ۴۰ کروڑ مارک خرچ کئے گئے۔ اس سے بھاری سامان کی پیداوار چوگنی ہو گئی جبکہ اس عرصے میں عام استعمال کے سامان کی پیداوار میں ۵۰ فیصد اضافہ بھی نہ ہوا۔ ۱۹۲۸ء کے بعد سے روس کی معیشت میں بھی یہی رجحان نظر آتا ہے۔ بھاری اور جنگی سامان کی صنعت میں زبردست ترقی

---

* نیویارک ٹائمز ۲۳ مئی ۱۹۶۲ء۔ سینیٹ کی تحقیقاتی سب کمیٹی کے روبرو مسٹر NUNNALLY کی شہادت۔

۵ MONOPOLY IN AMERICA از ADAMS AND GRAY صفحہ ۱۰۲

اور عام استعمال کے سامان کی پیداوار میں نمایاں کمی۔

سنہ ۱۹۵۷-۵۸ء کے لئے امریکہ کے بجٹ کے تجزیئے سے ظاہر ہوتا ہے کہ کُل اخراجات کا ۴۵ فیصد حصہ صنعت، زیادہ تر بھاری سامان کی صنعت کے لئے براہ راست ٹھیکوں سے تعلق رکھتا ہے۔[۴۸] دوسرے ترقی یافتہ ممالک کے سرکاری اخراجات کے محتاط تجزیئے سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے بیشتر ممالک میں بھاری اور جنگی صنعتوں کی پیداوار کی رفتار برقرار رکھنے میں فوجی اخراجات اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ امریکہ میں دفاعی اخراجات کے سبب کل قومی پیداوار (G.N.P) کا تناسب ۸٫۲ فیصد ہے۔ مغربی جرمنی میں یہ تناسب ۴٫۷ فیصد، یوگوسلاویہ میں ۶٫۷ اور روس میں ۹٫۴ فیصد ہے۔[*]

بین الاقوامی میدان میں ہتھیاروں کی فروخت نجی اداروں اور حکومت ہی کے ہاتھ میں ہے۔ ہتھیاروں کی فروخت کا سب سے بڑا تجارتی ادارہ SAMUEL CUMMING'S INTERNATIONAL ARMAMENT CORPORATION ہے جس کے ہاتھ میں ہتھیاروں کی بین الاقوامی تجارت کا ۹۰ فیصد حصہ ہے۔ یہ ادارہ، سی آئی اے کے اشتراک و تعاون سے کام کرتا ہے۔ اس کا کاروبار تقریباً ڈیڑھ کروڑ ڈالر سالانہ کا ہے اور سالانہ منافع تقریباً پچاس لاکھ ڈالر ہے۔[۴۹]

۴۸۔ U.S. NEWS AND WORLD REPORT ۱۰ مئی ۱۹۵۷ء۔ اس تجزیئے سے ظاہر ہوتا ہے کہ دیگر باتوں کے علاوہ جہاز سازی کی صنعت کو سات ارب ۴۰ کروڑ ڈالر گائڈڈ میزائل کی صنعت کو دو ارب ڈالر، سمندری جہازوں کی صنعت کو ایک ارب تیس کروڑ ڈالر۔

* PUBLIC EXPENDITURE IN COMMUNIST AND CAPITALIST COUNTRIES از FREDERIC L. PRYOR مطبوعہ ۱۹۶۸ء ص ۹۱

یہ تمام اعداد و شمار ۱۹۶۲ء کے ہیں۔

۴۹۔ THE WAR BUSINESS باب دوم۔ نجی اداروں کی تفصیلات کیلئے ملاحظہ کیجئے باب سوم۔ نجی اداروں اور سی آئی اے کے باہمی تعلق کے لئے واشنگٹن پوسٹ ۲۳ مئی ۱۹۶۱ء میں DEW PEARSON کا مقالہ۔

حکومتیں بھی تجارتی مقاصد کے پیش نظر ہتھیاروں کی فروخت میں مصروف ہیں۔ فروخت کئے جانے والے بیشتر ہتھیار ناقص ہوتے ہیں اور یہ ناقص ہتھیار بھی انتہائی مہنگے داموں فروخت کئے جاتے ہیں۔ ابتداء میں امریکی ہتھیار امداد کے طور پر دیئے جاتے تھے مگر جلد ہی امداد کے بجائے ہتھیاروں کی فروخت کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ اس وقت صرف امریکہ دو ارب ڈالر سالانہ کی مالیت کے ہتھیار فروخت کر رہا ہے۔ اس سلسلے میں ہر کاروباری طریقے سے کام لیا جاتا ہے٭٭۔ ہتھیاروں کی فروخت کے سلسلے میں ترغیب ہی نہیں بلکہ کھل کر دباؤ ڈالا جاتا ہے جس طرح مغربی جرمنی کے ساتھ کیا گیا تھا۳۔ نہ صرف دباؤ بلکہ دوسرے جائز ناجائز طریقوں سے بھی کام لیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر سعودی عرب کو LIGHTNING جیٹ اور HAWK میزائل فراہم کئے گئے جو سعودی عرب جیسے ملک کی جغرافیائی ضرورتوں کے مطابق نہیں ہیں۴۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہتھیاروں کے تاجروں کو دولت و منافع کے لالچ اور استحصال کی خواہش نے اندھا کر دیا ہے۔ اور وہ ہر قسم کے انسانی جذبات سے عاری ہو گئے ہیں۔ وہ بنی نوع انسان کا انتہائی مکروہ اور جابرانہ انداز میں استحصال کر رہے ہیں۳۳۔ اس استحصال سے نہ صرف سیاسی مقاصد پورے کئے جاتے ہیں بلکہ اپنی ادائیگیوں کے توازن کو بہتر بنانے کے لئے فالتو سامان سے بھی چھٹکارا مل جاتا ہے۴۴۔ اگر خریدار ملک ہتھیاروں کی قیمت ادا کرنے کے قابل نہیں ہیں اور بیشتر ملکوں کا یہی حال ہوتا ہے تو (امریکہ اور روس کی) حکومتیں انہیں ان خریداریوں کے لئے سودی قرضے دیتی ہیں۔ عجیب بات ہے کہ واشنگٹن کا برآمد و درآمد کا بینک بھی "COUNTRY -X .ACCOUNT" کے پردے میں ہتھیاروں کی خریداری

٭٭ THE WAR BUSINESS صفحات ۱۸۹-۱۸۲

۳ بحوالہ متذکرہ بالا صفحات ۲۲۱-۲۱۵

۴ بحوالہ متذکرہ بالا صفحات ۲۴۸-۲۴۷

۳۳ بحوالہ متذکرہ بالا باب چہارم تا ہشتم

۴۴ بحوالہ متذکرہ بالا صفحہ ۲۲۴

کے لیے قرضے دے رہا ہے۔ بنک یہ قرضے محکمہ دفاع کو دیتا ہے اور سود کی شرح ساڑھے تین سے ساڑھے پانچ فیصد تک ہوتی ہے۔ خریداری کرنے والے ممالک محکمہ دفاع کو سود ادا کرتے ہیں جس کی شرح اکثر بنک کی مقررہ شرح سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔++ ۱۹۶۵ء کے وسط سے جون ۱۹۶۷ء کی درمیانی مدت میں محکمہ دفاع کو اس مد میں ساٹھ کروڑ چالیس لاکھ ڈالر کے قرضے دیئے تھے اور اگلے دو برسوں میں مزید ایک ارب ڈالر کے قرضوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ۱۹۶۳ء سے ۱۹۶۷ء تک اس فنڈ کے ذریعے ترقی پذیر ملکوں کے ہاتھ فوجی ساز و سامان کی فروخت میں تین گنا اضافہ ہوا۔*

اس تجارت میں امریکہ تنہا نہیں ہے بلکہ برطانیہ، فرانس، روس، چیکوسلاوکیہ اور کچھ دوسرے ممالک بھی یہ کاروبار کر رہے ہیں۔** یہ تجارت جنگ کو ہوا دینے میں اہم کردار انجام دے رہی ہے۔ ہتھیاروں کی فروخت سے جو صورت حال پیدا ہو رہی ہے اس کے جائزے کے لئے ہم ایک بار پھر THAYER کے خیالات پیش کریں گے۔۵

THAYER کا کہنا ہے "دوسری جنگ عظیم کے بعد جو لڑائیاں ہوئیں اُن میں سے ۹۵ فیصد لڑائیاں ترقی پذیر ملکوں میں ہوئیں اور ہر لڑائی میں باہر سے منگائے ہوئے ہتھیار استعمال کئے گئے۔ اگر کوئی ملک ہتھیار حاصل کرنا چاہتا ہے تو اب یہ کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ سب سے زیادہ آسان بات چھوٹے ہتھیاروں کی خریداری ہے اور یہ ہتھیار صرف ہتھیار بنانے والے ملکوں اور نجی اداروں ہی سے نہیں بلکہ بے شمار ذریعوں سے حاصل کئے

++ ۔ مثال کے طور پر چلی کو COUNTRY-X. ACCOUNT کی مد میں دس لاکھ ڈالر کے ایک قرضے پر ۵ فیصد کی شرح سے محکمہ دفاع کو سود ادا کرنا پڑا جبکہ بنک نے ۴٫۷۵ فیصد کی شرح سے سود وصول کیا۔ بحوالہ متذکرہ بالا صفحہ ۲۰۹

* ۔ بحوالہ متذکرہ بالا صفحہ ۲۰۷

** ۔ کمیونسٹ ملکوں کی جانب سے ہتھیاروں کی فروخت کے لئے ملاحظہ کیجیے متذکرہ بالا کتاب باب ششم۔

۵ ۔ بحوالہ متذکرہ بالا صفحات ۳۵۳ - ۳۵۲

جاسکتے ہیں۔ اس سلسلے میں خصوصی طور پر ان ملکوں کا ذکر کیا جا سکتا ہے جو نئے اسلحہ تیار کر رہے ہیں اور اس طرح پرانے ہتھیار اُن کے لئے بے کار ہو گئے ہیں۔ بکتر بند گاڑیاں اور استعمال شدہ جیٹ ہوائی جہاز حاصل کرنا نسبتاً آسان ہے لیکن اس معاملے میں سودے کو خفیہ نہیں رکھا جا سکتا۔ جدید ترین ٹینک، لڑاکا ہوائی جہاز، بحری جنگی جہاز اور میزائل کے حصول میں کافی دشواری پیش آتی ہے کیونکہ یہ چیزیں متعلقہ ملک ہی سے اور اس کی رضامندی سے حاصل کی جاتی ہیں اس سلسلے میں صرف جدید ترین ہتھیاروں کی خریداری ہی پر کچھ پابندیاں ہیں۔ ان تمام باتوں کے باوجود متعلقہ ملک کی رضامندی کے بغیر بھی کسی دوسرے ملک کے ذریعے یہ ہتھیار خریدے جا سکتے ہیں جسے اس سودے کے نتائج کی کوئی پرواہ نہ ہو۔ ان ہتھیاروں کو بعد میں کسی اور ملک کے ہاتھ فروخت کرنے یا مدت ختم ہو جانے کے بعد بھی استعمال کرنے کے بارے میں جو پابندیاں لگائی گئی ہیں وہ غیر موثر ثابت ہوئی ہیں۔

"ہتھیار خریدنے والے ملک ایک عام اندازہ کے مطابق خریداری کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں بالخصوص اُن ملکوں کا نام لیا جا سکتا ہے جو ۱۹۴۵ء کے بعد آزاد ہوئے ہیں۔ پہلے مرحلے میں ایک ذریعے سے کم تعداد میں پرانے ہتھیار خریدے جاتے ہیں اور عموماً یہ ذریعہ سابق حکمراں ملک ہوتا ہے۔ کئی سال بعد دوسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے جب تمام اختیارات نئی حکومت کے ہاتھ میں ہوتے ہیں اور ایک قومی پولیس فورس یا فوج وجود میں آجاتی ہے۔ اس مرحلہ میں نئے اور مہنگے ہتھیار خریدے جاتے ہیں۔ یہ خریداری بڑی حد تک وقار کی خاطر اور کبھی کبھی جائز ضرورتوں کے لئے ہوتی ہے۔ یہ ہتھیار عموماً کسی ایک بڑے ذریعے سے طویل المیعاد امدادی پروگرام کے تحت حاصل کئے جاتے ہیں۔ مزید چند سال بعد جب خریدار ملک کو ہتھیار دینے والے ملک سے کوئی خاص دلچسپی نہیں رہتی تو خریداری کا تیسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے اور اس مرحلے میں خریداری کے ذرائع بڑھانے کے پروگرام کا آغاز ہوتا ہے۔

"ہتھیاروں کی خریداری کے دوسرے مرحلے کے آخر میں کشمکش اور نتیجتاً جنگ کا امکان پیدا ہوتا ہے۔ بھاری تعداد میں ہتھیاروں کی موجودگی کے بعد دشمن ملکوں کے ساتھ ہتھیاروں کی دوڑ شروع ہو جاتی ہے۔ بڑے پیمانے پر ہتھیاروں کی خریداری اور موجودگی سے دونوں ملکوں ہی کے سیاسی اور فوجی تصورات بدلتے ہیں اور اُس علاقے میں جنگ کا آغاز ہو جاتا ہے۔ اکثر یوں بھی ہوا ہے کہ ایک علاقے میں صرف ہتھیاروں کی موجودگی ہی کی وجہ سے جنگ کے شعلے بھڑک اُٹھے۔ چونکہ ہتھیاروں کی فروخت اور رسد کے بیشتر انتظامات حکومتیں کرتی ہیں، بڑی طاقتیں زیادہ سے زیادہ جنگوں (خواہ جنگ کتنے ہی مختصر پیمانے پر کیوں نہ ہو) میں ملوث ہو جاتی ہیں اور یہ چیز بڑے پیمانے پر مشرقی اور مغربی بلاک کی مخالفت کا سبب بن جاتی ہے اگرچہ یہ لڑائیاں چھوٹے پیمانے پر ہوتی ہیں مگر ان کے اثرات اتنے دُور رس ہوتے ہیں کہ بڑی طاقتوں کا وقار خطرے میں پڑ جاتا ہے۔"

"لڑائی کے بعد ہتھیار حاصل کرنے والا ملک خواہ وہ کامیاب ہوا ہو یا شکست خوردہ ہو، ہتھیار حاصل کرنے کے ذرائع بڑھانے کا فیصلہ کرتا ہے۔ ہتھیاروں کی خریداری کی آسان و نرم شرائط سے ہتھیاروں کی دوڑ تیز ہو جاتی ہے۔ اس طرح بہتر ہتھیاروں سے لیس ملک، اپنا نیک و بد سوچے بغیر بڑے پیمانے پر جنگ کی طرف قدم بڑھانے لگتا ہے اور جب یہ ہولناک جنگ شروع ہوتی ہے تو معمولی اختلافات سنگین اختلافات کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور امن کے امکانات معدوم ہو جاتے ہیں۔"

ہم اس امر پر بخوبی روشنی ڈال چکے ہیں کہ جنگ اور سود کی بنیاد پر قائم ہونے والی استحصال پسند معیشت کا آپس میں کتنا گہرا تعلق ہے۔ اس سے ہمارا مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ دونوں نظام ہائے زندگی، سرمایہ دارانہ اور سوشلسٹ تباہی و بربادی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ایک ضابطہ اخلاق مرتب کر کے اور ایک ایسی بین الاقوامی عدالت انصاف قائم کر کے،

جو اپنے فیصلوں پر عمل کرا سکے، دُنیا میں ہتھیاروں کی یہ دَوڑ ختم کرائی جا سکتی ہے اور امن قائم ہو سکتا ہے مگر بڑی طاقتیں اس راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں کیونکہ ان کی معیشت کی خوشحالی اور بقا کے لئے ضروری ہے کہ یہ ناپسندیدہ اور انسانیت دشمن سرگرمیاں جاری رہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ بڑی طاقتیں، اپنی سرگرمیوں کے نتائج سے کبھی دامن نہیں چھڑا سکتیں۔ ماضی میں بڑی طاقتوں کو بھی جنگ سے بھاری جانی و مالی نقصان ہوا ہے (اس سلسلے میں ویت نام میں امریکی کارروائی تازہ ترین واقعہ ہے) اور آئندہ بھی انہیں ایسے ہی ہولناک نقصانات اُٹھانے پڑیں گے۔ اللہ کے بتائے ہوئے ضابطوں اور طرزِ حیات کی خلاف ورزی کے نتیجے میں انسان کو اسی طرح تباہ کن جنگوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔* ہم ان ضابطوں کو ٹھکرا کر نتائج کی ذمہ داری سے نہیں بچ سکتے۔ انسانی معاشرے کو پیش آنے والی جنگیں، انسانوں کے لئے ایک تنبیہ ہیں۔ کم از کم مسلمانوں سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ نوشتۂ دیوار پڑھ لیں اور اس بات کو محسوس کریں گے کہ اُن کی نجات، انسانیت کو تباہی کے دروازے پر لانے والوں کے نقشِ قدم پر چلنے میں نہیں بلکہ اسلامی طرزِ حیات کو رائج کرنے میں ہے۔

---

* اس نظام نے نفرت کی ایک اور شکل اور مختلف قسم کی جنگوں کو بھی فروغ دیا ہے۔ یہ علاقائی، فرقہ وارانہ اور معاشرے کے سماجی گروہوں کی جنگیں ہیں۔ نفرت جنگ ہی کی ایک صورت اور خدا کے حکم کی نافرمانی کی ایک شکل ہے۔ ہمارے خیال میں ہر شخص کو یہ نکتہ سمجھ لینا چاہئے کہ جب قرآن میں خدا کے خلاف جنگ کا ذکر کیا جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ انسانوں اور خدا کی فوجیں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہوں گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان، انسان کے خلاف، بھائی، بھائی کے خلاف، معاشرے کے مختلف طبقے ایک دوسرے کے خلاف، علاقے اور صوبے ایک دوسرے کے خلاف اور ایک قوم دوسری قوم کے خلاف جنگ آزما ہوگی۔ یہ تمام خرابیاں، سودی معیشت کے حریص افراد کی استحصال پسندانہ ذہنیت کا نتیجہ ہیں۔ یہی سبب ہے کہ قرآن میں سود کا کاروبار کرنے والوں کو دوسروں پر ظلم اور اُن کے استحصال کرنے والے کہا گیا ہے اور اس کاروبار کو قرآن میں ظلم بتایا گیا ہے۔

(قرآن پارہ دوم ۲۷۹)

اب ہم آخری نکتے پر بحث کریں گے اور وہ یہ کہ سود کو کس طرح ختم کر کے ایک بلاسودی معیشت کس طرح قائم کی جائے۔

ہمارے عقائد کا بُنیادی اور اہم تقاضا ہے کہ اسلامی مملکت وجود میں آتے ہی، اپنی معیشت کو اسلامی اصولوں کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرے۔ اسلام کا اقتصادی پروگرام جس بُنیاد پر قائم ہے اس کی چند باتیں یہ ہیں:۔ معیشت میں فرد کو مناسب و جائز مقام دیا جائے، اقتصادی سرگرمیوں اور سماجی و اخلاقی ذمہ داریوں کے لئے صحیح طرزِ عمل پیدا کیا جائے، سود ختم کر دیا جائے، زکوٰۃ رائج کی جائے، جائز و منصفانہ اقتصادی تعلقات قائم کئے جائیں، حقیقی اقتصادی محرّکات پیدا کئے جائیں اور زندگی کے ہر شعبے میں باہمی اشتراک و تعاون کو فروغ دیا جائے۔ لیکن ہمیں یہ عرض کرنے دیجئے کہ اس پروگرام میں اہم ترین نکتہ سود کا خاتمہ اور زکوٰۃ رائج کرنا ہے۔ ان دو باتوں سے دیگر مقاصد خود بخود پورے ہو جائیں گے۔ ان دو باتوں میں ایک ایسی معیشت کی تعمیر و تشکیل کا راز پوشیدہ ہے جس کا مقصد صرف بنی نوع انسان کی بھلائی ہے۔ سود کے خاتمے سے سرمایہ دارانہ ذہنیت اور اقتصادی شعبے میں استحصال کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔ اس سے اقتصادی زندگی کی تمام خرابیاں دُور ہو جائینگی۔ اسی طرح زکوٰۃ رائج کرنے سے دولت کی تقسیم کے نظام میں ایک انقلاب آ جائے گا اور حقیقی معنوں میں سماجی انصاف کی بُنیاد رکھی جا سکے گی۔ ہم یہاں بلاسودی معیشت کے قیام کے سلسلے میں چند تجویزیں پیش کرنا چاہتے ہیں:۔

یہاں میں ایک ذاتی واقعہ کا ذکر کروں گا۔ ایک بار ایک دوست نے مذاقاً مجھ سے کہا کہ بلاسودی معیشت ایک "بے جان و خشک معاشرہ" ہوگی۔ اس کے جواب میں صرف یہ کہہ سکا کہ ہاں جو لوگ دوسروں کے استحصال کے سہارے زندہ و خوش حال رہنا چاہتے ہیں اور جو منصفانہ طور پر کاروبار کے نفع و نقصان میں دوسروں کو شریک کرنا نہیں چاہتے اُن کے لئے یہ ایک "بے جان معاشرہ" ہوگا۔ اس معاشرہ میں ان کی دلچسپی کا کوئی سامان نہیں ہوگا البتہ

جو لوگ حقیقی معنوں میں اقتصادی سرگرمیوں میں حصہ لینا چاہتے ہیں وہ کامیابی کے بہتر امکانات سے ہمکنار ہوں گے۔ ان تمام باتوں کے علاوہ تمام افراد مساوی شرکت کی بُنیاد پر اقتصادی سرگرمیوں میں حصہ لے سکیں گے اور یوں دُنیا میں تمام اختلافات ختم کرنے اور زندگی کے اصل و حقیقی مقاصد حاصل کرنے میں مدد ملے گی۔ میں نے اپنے دوست کو جو جواب دیا تھا وہ محض ایک خیال یا رائے نہیں کیونکہ مجھے اس بات کی صداقت پر مکمل یقین ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان کے بیشتر مسائل اور خرابیوں کا اصل سبب ہماری معیشت ہے جو سود کی بُنیاد پر قائم ہے اور اس سے براہ راست اور بالواسطہ استحصال کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔

اکثر اوقات مجھ سے بعض احباب نے کہا ہے کہ بلا سودی معیشت کا قیام اور بقا ممکن نہیں۔ میرے خیال میں یہ بات دُرست نہیں۔ یہ تو ایسے ہی ہے جیسے کہا جائے کہ ایک شر پسند معاشرہ کے بغیر زندہ نہیں رہا جا سکتا یا بے ایمانی سے کام لئے بغیر کوئی شخص دُنیا میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ بقا کی خاطر شر پسندی، استحصال اور بددیانتی کی حوصلہ افزائی کی جائے یا یہ کہ چوری چکاری، لوٹ مار، آگ لگانے، عریانیت کا مظاہرہ کرنے، نشہ آور ادویات کے استعمال، زنا اور قتل و غارت گری وغیرہ کی کھُلی چھُوٹ دے دی جائے کیونکہ ان چیزوں کے بغیر زندگی میں کوئی کشش اور دلچسپی باقی نہیں رہے گی۔ اگر بحث کے اس انداز کو بہتر طریقہ سے بحث تسلیم کیا جا سکے۔ مان لیا جائے تو یہ مناسب نہیں ہے۔ درصل اسی رویّے سے معاشرے میں خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اور تمام جرائم اور تشدد انگیز کارروائیوں کا سبب افراد کا یہی رویّہ ہے۔ جو لوگ اس انداز میں سوچتے ہیں وہ اس حقیقت کے باوجود کہ اس سلسلے میں خدا کے بتائے ہوئے واضح اصول اور دانشوروں کے بصیرت آمیز خیالات موجود ہیں، بزعم خود اپنی فہم و فراست پر نازاں ہیں اور ان کے نزدیک خود اپنے خیالات ہی سب سے زیادہ اہم ہیں۔

یہ بات تاریخ سے ثابت ہو چکی ہے کہ صدیوں تک مسلمانوں کی معیشت انتہائی خوشحال تھی اور مسلمانوں نے سود کو اپنے اقتصادی نظام میں کبھی شامل نہیں کیا۔ یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ۱۹۳۰ء میں جرمنی میں بلا سودی بنکنگ کا تجربہ کامیاب ہو چکا ہے۔ روس کے انقلاب کے بعد وہاں بھی تقریباً دس سال تک کم و بیش بلا سودی معیشت کا وجود رہا لیکن دونوں نظام ہائے زندگی یعنی نازی ازم اور سوشلزم میں چونکہ سود کے خلاف کوئی ٹھوس اصول موجود نہیں اس لئے وہ حقیقی سرمایہ دارانہ ذہنیت کا مقابلہ نہیں کرسکے اور انھوں نے بھی سود کو اپنے مفاد کے پیش نظر قبول کرلیا۔ اس کے باوجود کوئی شخص اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتا کہ ان ملکوں میں خواہ تھوڑے عرصے ہی کے لئے سہی، بلا سودی معیشت کا وجود رہا ہے۔ خود مغربی ملکوں کے دانشور بھی سود کی افادیت اور اسے اپنے اقتصادی نظام میں باقی رکھنے کے بارے میں شکوک و شبہات میں مبتلا ہیں۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر ROY HARROD نے یہی سوال اُٹھایا ہے یعنی کیا سود ناگزیر ہے؟ *

لارڈ KEYNES نے بھی اپنی معرکۃ الآرا تصنیف GENERAL THEORY OF INTEREST, EMPLOYMENT AND MONEY میں یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ:۔

"اگرچہ یہ حالات فرد کی عظمت کے احیاء کے سلسلے میں ایک رکاوٹ ہیں تاہم اس کا مطلب یہ ہے کہ زمیندار اور نتیجتاً سرمایہ دار اپنی مجموعی قوت و اثر سے کام لے کر سرمائے کی قلت کو اپنے مفاد میں استعمال کرنا چاہتا ہے۔ سرمائے پر سود یا زمین کے کرائے کے طور پر حاصل ہونے والی رقم میں کوئی خاص فرق نہیں۔ جس طرح زمیندار اپنی زمین کا کرایہ وصول کرتا ہے اسی طرح سرمایہ دار اپنی رقم پر سود حاصل کرتا ہے۔ بنیادی اصول دونوں جگہ یکساں ہے یعنی زمین اور سرمایہ دونوں کی قلت۔ اس سلسلے میں زمین کی کمی کے معقول اسباب تو موجود ہیں مگر سرمائے

---

* R.F. HARROD: TOWARDS A DYNAMIC ECONOMIC باب سوم

کی کمی کا کوئی معقول و مناسب جواز ہرگز موجود نہیں ہے۔[۵]

KENEYS نے واضح الفاظ میں کہا ہے:۔

" ایک ایسے معاشرے میں جو جدید فنی وسیلے رکھتا ہے اور جس میں آبادی میں تیزی سے اضافہ نہیں ہو رہا ہے ایک نسل کے دوران ہی سرمائے کی تشریحی صلاحیت (MARGINAL EFFICENCY) کو کم سے کم کرنے کے لائق ہونا چاہیے تاکہ ہم ایسے حالات پیدا کر سکیں جن میں فنی معلومات 'ضرورت' آبادی اور معاشرتی اداروں میں تبدیلیوں کے ذریعے سماجی حالات بہتر بنائے جا سکیں اور ترقی کی جائے نیز سرمائے سے حاصل ہونے والی پیداوار اور اُجرتوں میں معقول تناسب موجود ہو۔ پیداوار اور اُجرت کے تناسب کیلئے بھی ویسے ہی اُصول مرتب کئے جائیں جیسے عام استعمال کی چیزوں کی قیمتوں کے تعین کے لئے کئے جاتے ہیں اور جن سے سرمائے کی مد میں اخراجات کم سے کم ہو جاتے ہیں"۔

" اگر ہمارا یہ مفروضہ درست ہے کہ عام ضرورت کا سامان لوگوں کو بآسانی اور سہولت کے ساتھ مل سکتا ہے تاکہ سرمائے کی تشریحی صلاحیت کم سے کم کر دی جائے (یعنی سود کم سے کم یا بالکل ختم کر دیا جائے) تو اس طرح سرمایہ داری کی بہت سی قابلِ اعتراض بُرائیوں سے نجات پانا آسان ہو جائے گا۔ اس طرح رقم قرض دینے والا گروہ ختم ہو جائے گا اور فائدہ مند کاروبار اور فنی سوجھ بوجھ سے معاشرے کو ترقی دی جا سکے گی"۔[۶]

پروفیسر HARROD نے KEYNES کے بلاسودی معیشت کے نظریئے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

" میں پھر کہوں گا کہ ایسا معاشرہ قائم کرنے کے لئے ٹھوس اور تدریجی اقدامات ضروری ہیں۔ تاہم ہمیں اس مسئلے کے تمام پہلوؤں کا کما حقہ جائزہ لینا چاہیے۔ اگر ایسا

---

۵ — GENERAL THEORY صفحہ ۳۷۵

۶ — بحوالہ متذکرہ بالا صفحہ ۲۲۱

کوئی معاشرہ وجود میں آگیا تو یقیناً یہ ایک فقید المثال معاشرہ ہوگا۔"

"میرے خیال میں سرمایہ داری کے نقادوں کو اس سے بہتر اور مکمل جواب کسی دوسری صورت میں نہیں دیا جا سکتا۔ اور چونکہ یہ صحیح اور مناسب جواب ہے اس لئے سرمایہ داروں کے اجتماعی استحصال پسندانہ ہتھکنڈوں کو ختم کرنا ممکن ہوگا۔ اجتماعیت پسندی (اشتراکیت) کے پس پشت جو جذبہ کام کر رہا ہے حقیقتاً وہ یہ نہیں کہ ایک اشتراکی معاشرہ قائم کیا جائے۔ اشتراکیت کی قوت و مقبولیت کا اصل سبب یہ ہے کہ صرف اسی طریقے سے سرمایہ دار کو اپنی مجموعی قوت وافر سرمائے کو اپنے مفاد میں استعمال کرنے سے نہ صرف روکا جا سکتا ہے بلکہ اس سے نجات حاصل کی جا سکتی ہے۔"

"اگر ہم اجتماعیت پسندی (اشتراکیت) کا کوئی موزوں متبادل تلاش کرلیں تو کیا یہ بلا سودی معیشت نہیں ہوگا۔ اس طرح کیا مظلوم انسانوں کی صدیوں پرانی نفرت کو ختم نہیں کیا جا سکتا؟ کیا یہ افراد آزاد کاروبار اور منافع کے تناسب کو مختلف انداز میں نہیں دیکھیں گے؟ حقیقت یہ ہے کہ کسی کاریگر اور ہنرمند فرد کو اپنے فن سے جو آمدنی ہوتی ہے اُکوئی شخص بھی اسے ناپسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتا اس کے برعکس کوئی محنت کئے بغیر حاصل کی جانے والی زبردست آمدنی و منافع کو اپنے خاندان اور اپنی ذات تک محدود کرنے والے افراد کو لوگ پسند نہیں کرتے۔ ہم یہاں یہ فرض کر لیتے ہیں کہ اس طرح ناجائز منافع حاصل کرنے والے افراد کو قانونی تحفظ حاصل ہے۔ اس صورت میں بھی آزاد کاروبار اور مناسب و جائز منافع حاصل کرنے کا ماحول پیدا کیا جا سکتا ہے۔ لوگوں کے دل میں منافع کے خلاف کوئی نفرت نہیں جو محنت، حوصلے اور کاروبار کے نتیجے میں حاصل ہوتا ہے بلکہ وہ سود کو ناپسند کرتے ہیں۔"

R.F. Harrod ازیرو تفسیر Towards A Dynamic Economics — مطبوعہ ۱۹۴۸ء میکملن اینڈ کمپنی لندن صفحہ ۱۴۷-۱۴۸

Harrod اور Keynes کے مندرجہ بالا خیالات پیش کرنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ ہم اپنے نظریات کے حق میں مزید ٹھوس آراء پیش کر سکیں۔ ضروری نہیں کہ تمام افراد اقتصادی تحریکات بلکہ ان ممتاز اقتصادی ماہروں کے خیالات سے پوری طرح اتفاق کریں لیکن ہمارا بنیادی مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ بلاسودی معیشت کا نظریہ کوئی انہونی اور اچھنبے میں ڈالنے والی بات نہیں ہے۔ یہ مغربی ماہرین اقتصادیات، اسلام کے اقتصادی و اخلاقی نظام کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ لیکن انہوں نے بڑی بے باکی کے ساتھ اپنے انقلابی خیالات کا اظہار کیا ہے اور علمی دنیا میں ان خیالات کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس لئے مسلم دانشوروں کو چراغ پا ہونے کی ضرورت نہیں اور یہ بے معنی سوال دریافت نہیں کرنا چاہئے کہ آیا بلاسودی معیشت کا وجود برقرار رہ سکتا ہے؟ بلاسودی معیشت نہ صرف برقرار رہے گی بلکہ اس سے انشاء اللہ اقتصادی نظریات اور اقتصادی سرگرمیوں میں ایک انقلاب آ جائے گا اور حقیقی معنوں میں انسان کی خوشحالی اور سماجی انصاف کے ایک نئے دور کا آغاز ہو گا۔

---

۵ — یہاں ہم پاکستان کے ایک ممتاز ماہر اقتصادیات ڈاکٹر ایم این ہدی کے ایک مقالے کا حوالہ دیں گے۔ ڈاکٹر ہدی کا خیال ہے کہ "اسلام کے لئے جدید معیشت کا اہم ترین چیلنج یعنی سود بھی رفتہ رفتہ اپنی اہمیت و افادیت کھو رہا ہے۔ ہر شخص بخوبی واقف ہے کہ اسلام نے سود کی مخالفت کی ہے خواہ اس کا مقصد یا نتائج کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔ سود سے رقم ادھار دینے اور لینے والے کے درمیان پہلے سے طے شدہ شرح کے مطابق رقم کی ادائیگی کا تعین ہوتا ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ موجودہ زمانے میں کسی ترقی پذیر معیشت کے لئے سود ایک لازمی جزو کی حیثیت رکھتا ہے تاکہ عام لوگوں میں بچت کی عادت ڈالی جائے، ان رقموں کو بنکوں میں جمع کرایا جائے اور اس سے سرمایہ کاری کا کام لیا جائے۔ اس صورت میں سود اقتصادیات اور اقتصادی منصوبہ بندی کی بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا درحقیقت یہ خیال درست ہے؟ کیا واقعی سود اقتصادی سرگرمیوں میں اتنا ہی اہم کردار ادا کر رہا ہے؟ یہ درست ہے کہ سود کا منڈی کے طریقے پر تعین کیا جاتا ہے اور ممکن ہے کہ آزاد کاروبار کے عروج کے زمانے میں سود ایک موثر عنصر کی حیثیت رکھتا ہو مگر دنیا میں پہلے مرکزی بنک کے قیام کے بعد حالات یکسر تبدیل ہو گئے۔ بنک نے سود کی شرح کے تعین کے سلسلے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ اس وقت بھی جب سود سے اقتصادی

اب ہم اس مسئلے کے عملی پہلو کا جائزہ لیں گے۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں پیشہ ور اقتصادی ماہر نہیں تاہم مجھے اُمید ہے کہ ایک قوم کی حیثیت سے اگر ہم صحیح راستہ اختیار کر لیں تو یہ تمام مسئلے حل ہو جائیں گے۔ اہلیت اور صلاحیت رکھنے والے افراد ضروری اصلاحات کے نفاذ کے تیار کرنے کے لئے آمادہ ہوں گے جن سے ہماری معیشت اور معاشرہ کا انداز بدل جائے گا۔

بدقسمتی سے ہمارے بیشتر اقتصادی ماہرین اور منصوبہ بندی کے ماہر موجودہ زمانے کے نظریات سے بلند ہو کر اور اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق مسائل پر غور نہیں کرتے۔ میں اگر اس بات کو اپنی خوش قسمتی کہوں تو بے جا نہ ہو گا کہ میں نے جدید علوم سے اپنے سوچنے کے انداز اور فکر کو زنگ آلود نہیں ہونے دیا۔ بنا بریں ایک عام آدمی اور ایک عملی تاجر کی حیثیت سے میں اس مسئلے کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کر رہا ہوں جن سے بلا سودی معیشت کے قیام میں مدد مل سکتی ہے۔ ہمارے مسائل کے مختلف حل موجود ہیں مگر میں صرف ایسی تجاویز پیش کر رہا ہوں جو میرے نزدیک زیادہ معقول اور قابل عمل ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس سلسلے میں مزید قابل عمل تجاویز سامنے آئیں گی لیکن جہاں تک اس کتاب کا تعلق ہے میں اپنی تجاویز اس بنیادی خیال تک محدود رکھوں گا کہ پیچیدہ مسائل کا آسان اور سادہ ترین حل کیا ہے؟ اسلام کی صداقت کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اس دین کامل میں عالم و فاضل افراد کے ساتھ ساتھ عام آدمیوں کو بھی مطمئن کرنے کا مواد موجود ہے۔ اسلام ایک سیدھا سادا مذہب ہے۔ جو بات کوئی مفکر سینکڑوں صفحات میں کہے گا وہی بات رسول اکرمؐ

بقیہ حاشیہ ــــ وسیلوں سے کام لینے اور وسیلوں کی تقسیم پر اثر پڑ رہا تھا۔ سود پر سخت کنٹرول تھا اور سینٹرل بنک کی پالیسیوں کے نتیجے میں سود کی اہمیت کم سے کم ہو گئی تھی۔ اس وقت جبکہ دنیا میں ہر جگہ منظم معیشت موجود ہے۔ وسیلوں کی تقسیم ایک مسئلہ بن گئی ہے یہ مسئلہ سود کا مسئلہ نہیں بلکہ پسند کا مسئلہ ہے۔ اگر سرمایہ کاری کے شعبے مقرر کرنے کا اہم معاملہ طے ہو جائے تو سود اور حکومت کی دوسری پالیسیوں کا مقصد صرف سرکاری فیصلوں پر عملدرآمد کرنا، لوگوں کو سرمایہ لگانے کی ترغیب دینا اور ضروری ہو تو لوگوں کو سرمایہ کاری پر مجبور کرنا ہوتا۔ اس طرح موجودہ زمانے کی معیشت میں سود کا درجہ پہلے ہی کم سے کم کر دیا گیا ہے۔"

نے سادہ مثالوں کے ذریعہ چند الفاظ میں کہی ہے۔ جبر و اختیار کا مسئلہ بھی اتنا ہی پرانا ہے جس قدر قدیم خود فلسفہ ہے۔ کچھ لوگ انسان کو انتہائی مجبور کہتے ہیں تو دوسرے لوگ اُسے انتہائی خود مختار قرار دیتے ہیں۔ ایک بار یہی مسئلہ حضور اکرمؐ کے سامنے پیش کیا گیا۔ آپؐ نے اس موضوع پر طویل فلسفیانہ بحث کے بجائے سوال کرنے والے کو کھڑے ہو جانے کا حکم دیا اور فرمایا کہ ایک ٹانگ پر کھڑے ہو جاؤ۔ پھر آپؐ نے اُس شخص سے فرمایا کہ اب دوسری ٹانگ بھی اُٹھا لو اُس شخص نے کہا "یا رسول اللہ اس طرح کھڑا ہونا تو ممکن نہیں۔ دوسری ٹانگ اُٹھاتے ہی میں گر پڑوں گا۔" اس پر رسول اللہؐ نے فرمایا:-

"تم نے دیکھا کہ تم ایک ٹانگ پر کھڑے ہونے میں کس قدر مختار ہو اور دوسری ٹانگ اُٹھانے کی کوشش شروع کرتے ہی تمہاری خود مختاری کی حد ختم ہو جاتی ہے اگر تم دوسرا پاؤں بھی اُٹھانا چاہو (جس کا اختیار تمہیں نہیں دیا گیا ہے) تو تم گر جاؤ گے۔"

یہ تھا آنحضرتؐ کا سیدھا سادا جواب اس پیچیدہ مسئلے کے بارے میں۔ مگر اس سے یہ معلوم ہو گیا کہ فرد (بلکہ اقوام بھی) کیا کر سکتا ہے اور کیا کرنے کا اہل نہیں۔

اس مثال سے میرا مقصد یہ تھا کہ میں یہ بتاؤں کہ سیدھے سادے جوابات کیلئے میں نے کیا طریقہ اور ذریعہ اختیار کیا ہے۔ اگر اس سلسلے میں میں کامیاب نہ ہو سکوں تو یہ خود میری ناکامی ہوگی میرے طریقۂ کار کی ناکامی نہیں۔

عملی مسئلے کے حل کے سلسلے میں دو سوالات ہمارے سامنے آتے ہیں!

(۱) نجی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے قرضے جاری کرنے کا طریقۂ کار کیا ہونا چاہیئے؟

(۲) لوگوں کی بچت اور سرمائے کو سود کے بغیر کس طرح استعمال کیا جا سکتا ہے؟

نجی ضرورت پوری کرنے کے قرضے کے سلسلے میں ہم پہلی بات تو یہ عرض کرینگے کہ آخر فرد کو اس مقصد کے لئے قرضے کی ضرورت کیوں پیش آتی ہے:-

(۱) اس کے معاشی حالات اتنے ناگفتہ بہ ہیں کہ وہ خود اپنے وسیلوں سے اپنی اور

اپنے خاندان کی ضرورتیں پوری نہیں کر سکتا۔

(۲) اگرچہ ایک معقول و مناسب معیار کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لیے اُسے وسائل حاصل ہیں تاہم فضول خرچی کی وجہ سے اُس کے اخراجات پورے نہیں ہو پاتے۔

(۳) اس کی عام ضرورتیں پوری کرنے کے لیے اُس کے وسائل کافی ہیں لیکن ہنگامی مگر جائز ضرورت یا عام استعمال کا کچھ سامان خریدنے کے لیے اُسے مزید رقم کی ضرورت ہے اور اپنی آمدنی سے وہ یہ رقم حاصل نہیں کر سکتا۔

جہاں تک فضول خرچی کا تعلق ہے، اسلام اسے پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتا۔ بنا بریں فضول خرچی کے نتیجے میں معاشی بدحالی کا شکار ہونے والوں کو کوئی قرضہ نہیں مل سکتا۔ سود کی خرابیوں میں سے ایک خرابی یہ بھی ہے کہ فضول خرچی کے لیے قرضے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ اس خرابی کی وجہ سے ہزاروں خاندان مفلسی کا شکار ہو گئے ہیں۔ اسلامی اصولوں کے ذریعے ہی اس خرابی کو دور کیا جا سکتا ہے۔

جہاں تک پہلے معاملے کا تعلق ہے سوال یہ نہیں ہے کہ ضرورت مند افراد کو قرضے فراہم کیے جائیں بلکہ اصل مقصد اُن حالات کو ختم کرنا ہے جن کی وجہ سے کسی شخص کو قرضے لینے پڑتے ہیں۔ انصاف پسند معاشرے میں ہر شخص کو اتنی اُجرت ملنی چاہیے کہ وہ اور اس کے لواحقین ایک معقول معیار کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ اجرت کا تعین کام سے ہونا چاہیے مگر زندگی کا ایک کم از کم معیار مقرر کرنا ضروری ہے۔ اگر محنت اور اُجرت کا معیار مقرر کر دیا گیا تو ہر شخص کو اس کی ضرورت کے مطابق اُجرت مل سکے گی اور اس طرح نجی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے قرضے کی لعنت سے چھٹکارا مل جائے گا۔ اگر لوگوں کو اپنی بنیادی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے قرضہ لینا پڑتا ہے تو یہ سماجی اور اقتصادی ناانصافی کے مترادف ہے۔ اگر افراد کی اُجرتیں مستقل طور پر کم سے کم سطح سے نیچی رہتی ہیں تو وہ کبھی بھی اپنے قرضے ادا نہیں کر سکیں گے۔ درحقیقت اُنہیں اپنی

ضرورت پوری کرنے کے لئے ہر وقت نئے قرضے لینے ہوں گے اور اس طرح یہ مسئلہ کبھی حل نہیں ہو سکے گا۔

معاشرے کے اس طبقے میں ایسے افراد بھی شامل ہو سکتے ہیں جو مستقل معذوری کی وجہ سے کوئی کام کاج نہیں کر سکتے یا جو وقتی طور پر معذور ہو گئے ہیں۔ ایسے لوگوں کو قرضے کے سہارے زندگی گزارنے پر مجبور کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ یہ معاشرے کی ذمہ داری ہے کہ ایسے لوگوں کی بنیادی ضرورتیں پوری کی جائیں۔ زکوٰۃ اور سماجی تحفظ کے اسلامی نظام کے ذریعے ان افراد کی بنیادی ضرورتیں بخوبی پوری کی جا سکتی ہیں۔ اسلام کے زمانہ عروج میں ایسے افراد کی ضرورتیں بیت المال کے ذریعہ پوری کی جاتی تھیں اور آج بھی ہمارا معاشرہ یہ ذمہ داری انجام دے سکتا ہے۔ معذور افراد کے معاشرے پر حقوق ہیں اور انہیں باعزت زندگی بسر کرنے کا موقع ملنا چاہیئے نہ کہ یہ کہ ہم انہیں قرضے کے سہارے زندگی گزارنے پر مجبور کر دیں جس سے اُن کی تکالیف و مصائب میں ناقابل بیان اضافہ ہو جائے گا۔

اب ہم تیسرے گروہ کے مسائل کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کریں گے۔ یہ قطعی جائز ضرورت ہے اور اسے پوری کرنے کے لئے قرضے فراہم کرنے کا بندوبست ہونا چاہیئے۔ لیکن ان قرضوں پر سود وصول کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اسلامی معاشرے میں خاندان یا معاشرے کے دوسرے افراد نے ہمیشہ ایسی ضرورتوں کے لئے قرضے دیئے ہیں۔ مسلمانوں نے ان قرضوں پر سود کا کبھی مطالبہ نہیں کیا بلکہ ان کی بنیاد ہمیشہ باہمی تعاون کا یہ اصول رہا کہ ایک بھائی کی ضرورت کے وقت دوسرا بھائی مدد کرے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ایسی ضرورتوں کے وقت اگر کسی شخص کو نجی ذرائع سے مدد نہیں ملی تو بیت المال نے اس کی امداد کی ہے۔ بچوں کی تعلیم، شادی بیاہ، ناگہانی آفات یا ہنگامی ضرورت کے وقت بیت المال سے امدادی رقمیں اور قرضے جاری کئے جاتے تھے اور اس نظام کو دوبارہ رائج کرنا چاہیئے۔

مسلمانوں نے اپنے بھائیوں کی ہنگامی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے کچھ چھوٹے ادارے بھی قائم کئے تھے اور آج بھی کچھ ادارے موجود ہیں۔ دس یا بیس خواتین آپس میں مل جل کر ایک کمیٹی کی تشکیل کر سکتی ہیں جس میں ہر خاتون دس یا بیس روپے ماہانہ عطیہ کے طور پر دے اور یہ کمیٹی ضرورت کے وقت لوگوں کو سو روپے سے چار سو روپے تک کی رقم یکمشت ادا کر سکتی ہے۔ اسی اصول پر بڑی انجمنوں کو بھی جمع کیا جا سکتا ہے خواہ یہ کام چھوٹے پیمانے پر ہو یا باقاعدہ تنظیم کے طور پر اور اس طرح ہزاروں آدمیوں کو انسان دوستی، باہمی تعاون اور غیر استحصال پسندانہ طریقے پر فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ ماضی کی طرح آج بھی یہ تنظیم پیداوار بڑھانے کے لئے بھی قرضے دے سکتی ہے۔ ہندوستان کی ریاست حیدرآباد میں اس کا تجربہ کیا جا چکا ہے اور وہاں عرصے تک اس نظام پر کامیابی سے عمل ہوتا رہا۔ بلاسودی قرضوں کی یہ انجمنیں ۱۹۲۰ء میں امداد باہمی کے اصول پر قائم کی گئی تھیں اور ۱۹۴۸ء میں ریاست پر ہندوستان کے قبضے کے وقت تک موجود تھیں۔

۱۹۴۸ء میں ان انجمنوں کا طریقۂ کار یہ تھا کہ مثال کے طور پر ایک محکمہ کے اہل کاروں نے انجمن قائم کی تو ہر رکن نے اپنے وسائل کے مطابق ایک یا ایک سے زیادہ حصص خرید لئے اور حصص کی قیمت ماہانہ قسطوں میں ادا کرنی شروع کر دی۔ قسطیں ادا کرنے کی مدت سو مہینے ہوتی تھی۔ اگر کسی انجمن کے پاس حصہ دار ہیں تو پہلے مہینے ہی میں پچاس پونڈ (چھ سو روپے) جمع ہو جاتے تھے۔ انجمن کی منتخب انتظامیہ یہ فیصلہ کرتی تھی کہ کس شخص کو پچاس پونڈ کی یہ رقم قرض کے طور پر دی جا سکتی ہے (قرضے کے لئے ضمانت ضروری تھی)۔ اگلے مہینے نہ صرف حصہ داروں کی طرف سے پچاس پونڈ کی رقم وصول ہوتی تھی بلکہ قرضہ لینے والے شخص کی طرف سے بھی پہلی قسط کی رقم وصول ہو جاتی تھی۔ اس طرح ہر مہینے سرمائے میں اضافہ ہوتا رہتا اور یہ سرمایہ برابر گردش کرتا رہتا۔ چند برسوں میں انجمن کے پاس اتنا سرمایہ موجود ہوتا کہ اراکین کی کم و بیش تمام ضرورتوں کے لئے

قرضہ فراہم کیا جا سکتا تھا۔

علاوہ ازیں انجمن کے اراکین اپنی فاضل رقم بھی انجمن کے پاس جمع کراتے تھے اور وقت ضرورت رقم واپس لینے کے مجاز تھے۔ انجمن کے پاس جمع ہونے والی کسی رقم پر سود کا سوال ہی نہ تھا۔ اس طرح سرمائے میں اضافے کے بعد مزید بلا سودی قرضے بھی جاری کیے جا سکتے تھے۔ نہ صرف یہ کہ انجمن کی رکنیت کے لئے ہر وقت لوگ تیار رہتے اور انجمن کے سرمائے میں اضافہ کرتے بلکہ پرانے اراکین کو یہ اختیار بھی تھا کہ وہ اپنی رکنیت ختم کر کے اپنی جمع شدہ رقم اور اپنے حصص کی قیمت وصول کر سکتے ہیں۔ انجمن کے اخراجات مثلاً اسٹیشنری اور محاسب (ACCOUNTANT) کی تنخواہ کے لئے اراکین سے برائے نام رقم وصول کی جاتی تھی۔ چھوٹی انجمنوں میں اعزازی طور پر کام کیا جاتا تھا اور دفتری اخراجات کے لئے وصول ہونے والی رقم اکثر اتنی زیادہ ہوتی کہ اسے محفوظ سرمائے کی مد میں جمع کر دیا جاتا تاکہ ہنگامی ضرورت میں کام آسکے۔

"مجھے معلوم ہے کہ چند انجمنوں نے جن کے اراکین کی تعداد ہزاروں تک پہنچی تھی، محفوظ سرمائے کی مد میں اتنی بھاری رقم جمع کر لی تھی کہ انہیں خراب نہ ہونے والی چیزوں مثلاً اناج، کپڑے وغیرہ کے اسٹور کھولنے پڑے تھے جو امداد باہمی کے اصول پر چلائے جاتے تھے۔ ان اسٹوروں سے انجمن کے اراکین ادھار پر سامان خریدتے تھے۔ اسٹور کے لئے تھوک کے حساب سے سامان خریدا جاتا اور پرچون میں فروخت سے کافی منافع ہوتا۔ اس طرح حاصل ہونے والے منافع کو اسٹور کے منتخب کارکنوں اور انجمن کے اراکین میں تقسیم کر دیا جاتا اور کچھ رقم محفوظ سرمائے کی مد میں جمع کر دی جاتی تھی۔" ؎

یہ صرف ایک تجویز ہے۔ ان ہی اصولوں پر بے شمار ادارے قائم کئے جا سکتے ہیں

؎ A SUGGESTION FOR AN INTEREST-FREE ISLAMIC MONETARY FUND از ڈاکٹر ایم حمید اللہ مطبوعہ اسلامک ریویو لندن۔

جن سے لوگوں کی خوشحالی میں اضافہ ہوگا اور سود کی لعنت میں مبتلا ہوئے بغیر بھی وہ زندگی گزار سکیں گے۔"

اب ہم پیداوار بڑھانے کے لئے قرضوں کے معاملے کا جائزہ لیں گے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ منافع میں شرکت کی بنیاد پر اگر تاجروں وصنعت کاروں کو تمام مالی وسیلوں سے فائدہ اٹھانے کا موقع مل جائے تو تجارت وکاروبار میں کئی گنا اضافہ ہو جائے گا۔ اس سے معیشت میں لوگوں کی مکمل شراکت میں اضافہ ہوگا اور اقتصادی ترقی کی رفتار تیز تر ہوتی جائیگی۔ شراکت، جوائنٹ اسٹاک کمپنی اور باہمی تعاون کے اصولوں پر تجارتی اور صنعتی ادارے قائم کئے جاسکتے ہیں اور کاروبار سے سود کا وجود ختم کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح بھاری سود وصول کرنے والے بنکوں کے فراہم کئے ہوئے سرمائے سے قائم ہونے والی معیشت کے مقابلے میں ایک زیادہ پائدار اور سود مند معیشت وجود میں آسکتی ہے۔

علاوہ ازیں پیداوار بڑھانے کے لئے بیت المال کے ذریعے بھی بلا سودی قرضے حاصل کئے جاسکتے ہیں بلکہ بیت المال اس سلسلے میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ دنیا بھر میں اقتصادی ترقی کے لئے حکومت کی طرف سے قرضے فراہم کئے جاتے ہیں اور یہ قرضے منافع حاصل کرنے کی غرض سے نہیں بلکہ ملک کی اقتصادی تعمیر نو کے مقصد کے پیش نظر فراہم کئے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر برطانیہ میں بعض شعبوں میں نئے کاروبار پر کل سرمائے پر حکومت کی طرف سے گرانٹ دی جاتی ہے۔ یہ گرانٹ، کل نئے سرمائے کے ۲۰ فیصد کے حساب سے دی جاتی ہے۔ "ترقیاتی علاقوں" میں یہ شرح ۴۰ فیصد تک پہنچ جاتی ہے۔ یہ کوئی سودی قرضہ بلکہ واپس کرنے والا قرضہ نہیں بلکہ امدادی رقم ہوتی ہے۔ خود ہمارے اپنے ملک میں حکومتوں اور دوسرے اداروں کی طرف سے ترقیاتی کاموں کے لئے بڑے بڑے قرضے فراہم کئے جاتے ہیں مگر ہم نے کبھی یہ سوچنے کی کوشش نہیں کی کہ بلا سودی قرضوں سے اقتصادی ترقی کی رفتار تیز کرنے اور عام لوگوں کے حالات بہتر بنانے میں کتنی مدد مل سکتی ہے۔

اس سلسلے میں اسلام کی جو روایات رہی ہیں اُن کے لئے ہم ایک بار پھر ڈاکٹر حمید اللہ کے مقالے سے ایک اقتباس پیش کریں گے :۔

"تاریخ شاہد ہے کہ اسلام کے ابتدائی عہد خصوصاً حضرت عمر فاروق کے زمانے میں سرکاری خزانے سے پیداوار کی ضمانت پر قرضہ لینے اور کسی سود کے بغیر یہ رقم ادا کرنے کا رواج تھا۔ حضرت عمر جیسے سخت مزاج خلیفہ نے بیت المال سے قرضہ لینے کو بُرا نہیں سمجھا جو بیت المال کو "یتیموں کا حق" قرار دیتے تھے۔ اس طرح انہوں نے جو قرضہ لیا وہ دیوان سے ملنے والے مشاہرے سے واپس ادا کر دیا جاتا۔"

"کوئی وجہ نہیں کہ بیت المال پھر قائم نہ کیا جائے اور جب یہ زمانے کی ضرورتیں پوری نہ کرے۔ مثال کے طور پر بیت المال سے مکان کی تعمیر یا کاروبار و صنعت شروع کرنے یا اُسے ترقی دینے کے لئے بیت المال سے رقم قرض لی جا سکتی ہے اور آسان قسطوں میں کئی سال کے اندر اندر اس رقم کی ادائیگی کی جا سکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حکومت اگر قرضوں پر سود کی رقم معاف کر دے تو اس سے حکومت کو کوئی نقصان نہیں ہوگا کیونکہ عوام کی خوش حالی میں اضافہ سے سود کی تلافی ہو جائے گی اور حکومت کو مکانوں اور تجارت و صنعت پر ٹیکس کی صورت میں زیادہ رقم وصول ہو سکے گی۔"

یہ اس مسئلے کا ایک پہلو ہے لیکن ایک تاجر کی حیثیت سے میں نہیں سمجھتا کہ بلا سودی بنکوں اور سرمایہ کاری کے اداروں کے قیام میں کوئی رکاوٹ ہے۔ جو افراد اور ادارے اس صورت میں سرمایہ لگائیں گے اُنہیں دام (یعنی سود) سے حاصل ہونے والی رقم کے مقابلے میں کہیں زیادہ رقم حاصل ہو گی۔ امریکہ میں I.O.S کا ادارہ اس سلسلے میں مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ یہ ادارہ، سرمایہ کاری کے یونٹوں کی صورت میں عوام سے رقم حاصل کرتا ہے اور اچھی کمپنیوں کے حصص اور زمین و مکانات کی خریداری میں رقم لگاتا ہے۔ پچھلے دس سال میں اس ادارے کی ترقی کی رفتار ۲۰ فیصد رہی ہے۔ ادارے کو کمیشن کے طور پر لاکھوں ڈالر

کی آمدنی ہوتی ہے اور اس اسکیم سے لوگوں کو کافی فائدہ پہنچ رہا ہے۔ یہ ادارہ پاکستان کے کئی بنکوں کے کاروبار سے بھی بڑے کاروبار کا مالک ہے۔ یہ سرمایہ کاری اور بنکاری کی ایک حلال شکل ہے اور سود کا کاروبار کرنے والے بنکوں سے کہیں بہتر۔[*] حقیقت یہ ہے کہ اس نظام کی ترقی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اس کے کاروبار کی بنیاد سود پر نہیں ہے۔ اس سلسلے میں برطانیہ کے سرمایہ کاری ٹرسٹ کے یونٹوں کی بھی مثال دی جا سکتی ہے۔ برطانیہ میں ایسے درجنوں ٹرسٹ اربوں پونڈ کا کاروبار کر رہے ہیں اور اس کاروبار میں سود شامل نہیں ہے۔ ہم یہاں صرف ایک مثال پیش کریں گے۔ SAVE AND PROSPER گروپ کے یونٹ کی مالیت ۱۹۵۲ء میں سو پونڈ تھی، ۱۹۶۸ء میں اس کی مالیت پندرہ سو پونڈ تک پہنچ گئی تھی۔[4] اس گروپ کے یونٹ ہولڈروں کی تعداد پانچ لاکھ ہے اور مجموعی طور پر انہوں نے ۴۵ کروڑ پونڈ کی رقم یونٹوں میں لگا رکھی ہے۔ بنکاری کے مقابلے میں ترقی کی یہ رفتار یقیناً انتہائی تیز ہے۔

پاکستان کے سوا دُنیا بھر میں ایسے ادارے موجود ہیں اور ترقی کر رہے ہیں۔ بنکاروں کو ان کے کاروبار سے گوناگوں خطروں کا سامنا ہے لیکن اس بات کا ہمارے تجزیے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہم صرف یہ تجویز پیش کرنا چاہتے ہیں کہ ایسے متبادل انتظامات موجود ہیں جہاں لوگوں کی بچت سے فائدہ اٹھا کر اسے سرمایہ کاری کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ معیشت کے نقطۂ نظر سے یہ سرمایہ کاری زیادہ مفید ہوگی اور فرد کو اس سے زیادہ منافع حاصل ہو سکے گا۔ اس قسم کے انتظام یا ایسے ہی دوسرے بندوبست سے سرمایے اور سرمایہ کاری سے براہ راست

---

* سرمایہ کاری کے ادارے شراب فروخت کرنے والے ہوٹلوں، نائٹ کلبوں اور نشہ آور ادویات کی صنعت میں سرمایہ لگاتے ہیں۔ اسلام کے نقطۂ نظر سے ایسا کاروبار حرام ہے اور اسلام کے اصولوں پر قائم ہونے والا سرمایہ کاری ٹرسٹ ایسے کاروبار میں سرمایہ نہیں لگائے گا لیکن جہاں تک سرمایہ کاری کے اداروں کا تعلق ہے ان کا کاروبار سود سے پاک اور اسلام کے لئے قابلِ قبول ہے۔

۴۔ THE TIMES ۲۶ جنوری ۱۹۷۰ء

تعلق نہ رکھنے والوں سے نجات حاصل کی جا سکے گی اور پہلے سے مقرر کردہ رقم کی ادائیگی سے چھٹکارا حاصل ہو جائے گا۔ اس انتظام سے معاشرے کے تمام افراد کو فائدہ پہنچے گا۔

یہاں ایک سوال کیا جا سکتا ہے کیا وجہ ہے کہ سرمایہ کاری کے یونٹوں کے ٹرسٹ نہ صرف زبردست ترقی کرتے ہیں بلکہ اپنے یونٹ ہولڈروں کو ہر سال معقول منافع بھی دیتے ہیں جبکہ بنک میں مقررہ مدت کے لیے رقم جمع کرانے کی صورت میں صرف ۵ یا ۶ فیصد سود ملتا ہے؟ اس کی وجہ بالکل سیدھی سادی ہے۔ عام لوگوں کو یہ نہیں معلوم کہ اپنی رقم کب اور کس کام میں لگائیں۔ وہ اپنی رقم ایک مقررہ سود کی شرح سے بنک میں جمع کر دیتے ہیں۔ بنکوں کے کاروبار کی نوعیت کچھ ایسی ہے کہ وہ اپنے تمام سرمائے کو نفع بخش کمپنیوں کے حصص میں نہیں لگا سکتے۔ علاوہ ازیں چونکہ بنک ایک مقررہ شرح سے سود ادا کرتے ہیں اس لیے وہ ادا کی جانے والی رقم کی شرح سے کہیں زیادہ شرح سے منافع حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ بنکوں کا کاروبار "محفوظ" سود کے نظریے پر چلایا جاتا ہے۔ اس لیے بنک مقررہ شرح سود پر تمسکات جاری کرنے یا تجارتی قرضے دینے پر مجبور ہیں۔ اس طرح بنکوں کو حقیقی طور پر تجارت یا صنعت میں حصہ لینے کا موقع نہیں ملتا بلکہ وہ محض عارضی طور پر رقم قرض دینے والے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہیں تجارت کے حقیقی منافع سے کوئی مطلب نہیں اُن کا مقصد تو محض سود حاصل کرنا ہے۔ اس لئے بنک میں اپنی بچت جمع کرنے والے افراد کے لئے منافع (یا سود) کی شرح بہت کم رہتی ہے اور سودی قرضوں سے حاصل ہونے والی پیداوار کی لاگت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ عام آدمی، خواہ وہ بچت جمع کرنے والا ہو یا صارف ہو، دونوں صورتوں میں نقصان ہوتا ہے۔

پاکستان میں قومی سرمایہ کاری ٹرسٹ (NATIONAL INVESTMENT TRUST) اس سلسلے میں ابتدائی اقدام کی حیثیت رکھتا ہے۔ مجھے فخر ہے کہ میں نے اسٹیٹ بنک آف پاکستان کے ایک سابق گورنر جناب عبدالقادر سے ملاقات میں

ایسا ٹرسٹ قائم کرنے کی تجویز پیش کی تھی۔* ٹرسٹ لوگوں کی بچت مُفید منصوبوں میں لگانے کے سلسلے میں کام کر رہا ہے مگر اس کی ترقی کی رفتار زیادہ اطمینان بخش نہیں ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ نجی بنکوں کے اصول پر ایسے بہت سے ٹرسٹ قائم کئے جائیں اور مملکت کی طرف سے ان کے کاروبار کی نگرانی کی جائے۔ اگر محتاط قسم کے تاجر ایسے ٹرسٹ قائم کریں تو کسی شک وشبہ کے بغیر یہ ٹرسٹ، بنکوں کے بہترین متبادل ثابت ہو سکتے ہیں۔ (میں نے محتاط کا لفظ یوں استعمال کیا ہے کہ ممکن ہے بورڈ کے ڈائریکٹر، ٹرسٹ کے سرمائے کو اپنے کاروباری منصوبوں کے لئے استعمال کرنا چاہئیں)۔ ٹرسٹ کے کاروبار کی طرح پاکستان میں بھی یونٹ ہولڈروں کو منافع کے علاوہ یونٹوں کے دام چڑھنے کے سبب مزید فیصد منافع دیا جائے گا۔ ٹرسٹ، منافع میں شرکت کی بُنیاد پر تاجروں اور صنعت کاروں کو قرضے بھی دے گا۔ یہ تمام کاروبار "حلال" رقم سے ہوگا اور حلال کام میں حرام کے مقابلے میں کہیں زیادہ منافع ہے۔**

---

* ۔ میں ٹرسٹ کے ڈائریکٹروں کے بورڈ کا کچھ عرصے تک رکن رہا ہوں اور بعد میں اپنے برادر گرامی کے حق میں میں نے اس عہدے سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ وہ اب بھی بورڈ کے ڈائریکٹر ہیں۔

** ۔ حلال اور حرام کی سادہ سی مثال کے طور پر میں نکاح کا ذکر کروں گا۔ کسی عورت سے تعلق، جنسی تعلق ہے خواہ وہ بیوی کے ساتھ ہو یا کسی طوائف و داشتہ کے ساتھ۔ بیوی کے ساتھ جنسی تعلق حلال ہے اور اسے مذہب اور معاشرے کی منظوری اور پسندیدگی حاصل ہے۔ طوائف کے ساتھ تعلق بھی اگرچہ جنسی تعلق ہے مگر مذہب نے اسے حرام قرار دیا ہے اسی طرح داشتہ کے ساتھ جنسی تعلق کو جدید معاشرے کے سوا ہر مذہب و معاشرے نے انتہائی ناپسندیدہ اور مکروہ فعل سمجھا ہے۔ سود بھی "دولت کے ساتھ ناجائز تعلق" ہے جبکہ جائز سرمایہ کاری کے نتیجے میں حاصل ہونے والا منافع نکاح کی طرح حلال ہے۔

جنسی تعلقات میں اس بنیادی حقیقت کے باوجود حلال و حرام کی تخصیص کر دی گئی ہے کہ مقصد ہر صورت میں یکساں ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اخلاقی پابندیوں کی بُنیاد نتائج پر ہوتی ہے نہ کہ نوعیت پر۔ حرام کے نتائج معاشرے کے لئے ہولناک اور بھیانک ہوتے ہیں۔ حرام تعلقات کے نتیجے میں جو اولاد ہوتی ہے اسے کوئی شخص قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتا اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کس کی اولاد ہے۔ اگر حرام اور ناجائز تعلقات کو جائز قرار دے دیا جائے تو خاندان کا شیرازہ بکھر جائے گا اور معاشرہ کا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

سود ایک "دیوپیکر خرابی" ہے۔ اگر کسی اسلامی معاشرے میں یہ خرابی موجود ہے تو اسے خود کو اسلامی مملکت کہنے کا کوئی حق نہیں کیونکہ حقیقت میں یہ معاشرہ، خدا اور اس کے رسولؐ کے واضح احکامات کی خلاف ورزی کر رہا ہے۔ ایسے معاشرے میں مختصر مدّت میں جو فوائد حاصل ہوتے ہیں آگے چل کر وہ تباہی و بربادی کا پیش خیمہ بن جاتے ہیں۔

ایک اسلامی مملکت کے پیش نظر اوّلین مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ اس خرابی سے نجات حاصل کی جائے۔ نتائج کے اعتبار سے غور کیا جائے تو کسی قوم کے لئے صرف سود ہی، دوسری تمام خرابیوں اور مسائل سے کہیں زیادہ خطرناک ہے۔ سود سے ہی گوناگوں خطرات درپیش ہیں اگر ہم نے کامیابی سے اس خطرے کا مقابلہ کیا اور اس پر قابو پالیا تو ہم پاکستانی قوم کو اس کے سب سے بڑے دشمن سے نجات دلا سکتے ہیں اور دنیا کو ترقی کی ایک نئی راہ دکھا سکتے ہیں۔

بقیہ صفحہ گزشتہ

یہی حال حرام دولت کا ہے خواہ یہ سب سے بڑے ذریعے یعنی بینک سے حاصل ہو یا رشوت وغیرہ سے حاصل کی جائے۔ چونکہ اس سے فرد اور معاشرے کو نقصان پہنچتا ہے اس لئے ایسی دولت کو حرام قرار دیا گیا ہے۔

باب دہم

خلاصہ اور نتائج

میں نے پورے عجز و خلوص کے ساتھ یہ عملی حل اور قابلِ عمل تجاویز پیش کی ہیں۔ میں ہر وقت ان تجاویز کی افادیت کا قائل رہا ہوں مگر گزشتہ آمریت اور نوکر شاہی کے عروج کے زمانے میں یہ تجاویز عوام کے سامنے پیش نہیں کر سکا۔

نوکر شاہی کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ عوام کو فریب میں مبتلا رکھا جائے اور فائدہ مند تجاویز اور اسکیموں کو اہمیت نہ دی جائے۔ نوکر شاہی خوبصورت لیکن کھوکھلے قلعے تعمیر کرنے اور اسے کارنامہ قرار دینے پر فخر کرتی ہے۔ اس کی غلطیاں پروپیگنڈے کے پردے میں چھپ جاتی ہیں اور ہر طرف بس حکمراں طبقے کے قصیدے گائے جاتے ہیں۔ ہمارے ملک میں پچھلے دس برس تک یہی ہوتا رہا اور خدا کا شکر ہے کہ اب لوگوں کو اپنے خیالات کے اظہار کا موقع ملا ہے۔

پاکستان کے قیام کا واضح مقصد یہ تھا کہ حضورِ اکرمؐ کی تعلیمات کی روشنی میں ایک اسلامی مملکت قائم کی جائے اور باہمی اخوت اور امن و امان کے ساتھ معاشرے کی ترقی کے لئے کام کیا جائے۔ ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ آنحضرتؐ کی تعلیمات کی روشنی پھیلانے کے لئے کام کرے اور لوگوں کو یہ معلوم ہو سکے کہ ترقی کا صحیح راستہ و طریقہ کیا ہے اور لوگ اپنے عمل کو قرآن اور سنت کے مطابق ڈھالیں۔ اسلام کے سنہری اصول ہر زمانے میں حقیقی امن و خوشحالی کے ضامن رہے ہیں۔ آج پھر ہمیں اُن اصولوں کو اپنانا چاہیئے تاکہ ہم دُنیا میں ترقّی کر سکیں۔ ان اصولوں کو نظر انداز کر کے ہم مصائب اور تباہی و بربادی کے سوا کچھ حاصل نہیں کر سکے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہم خدا کی ہدایت کی روشنی میں اپنے مسائل کا حل تلاش کریں۔ یہی کامیابی کا راستہ ہے دُنیا میں بھی اور

آخرت میں بھی۔ اور اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ:۔

"جو لوگ ہماری جانب بڑھتے ہیں، ہم انھیں راستہ دکھاتے ہیں"

اس کتاب میں مَیں نے پاکستان کو درپیش مسائل اور ان کے حل کے بارے میں اپنے خیالات پیش کئے ہیں۔ میں نے بنیادی طور پر ایک تعمیری اور نظریاتی اعتبار سے مستحکم حکمتِ عملی پر زور دیا ہے۔ ہمیں اپنے مسائل پر خود اپنے نقطہ نظر کے مطابق غور کرنا چاہیے نہ کہ سوشلسٹوں اور سرمایہ داروں کے زاویہ نظر کو اپنانا چاہیے۔ ہمیں ایک انصاف پسند اسلامی معاشرہ کے قیام کے لئے جدوجہد کرنی چاہیے تاکہ ہم نہ صرف حق و صداقت کے راستہ پر گامزن ہوسکیں بلکہ دوسرے لوگ بھی اس راستے کو اپنائیں۔ ہمیں اپنی پالیسیاں اس طرح مرتب کرنی چاہئیں کہ ہم کم از کم مدت میں زیادہ سے زیادہ ترقی کرسکیں اور ایسے طریقے اپنانے چاہئیں جو خود ہماری ہدایات اور قدروں کے مطابق ہوں۔ میں نے جو تجاویز پیش کی ہیں مختصراً یہ ہیں:۔

(۱) بڑے پیمانے پر صنعتی منصوبوں کی تشکیل کے بجائے ہمیں زراعت کو ترقی دینے کے لئے جامع منصوبے تیار کرنے چاہئیں۔ اس طرح صنعتی انقلاب کے بجائے ہم ایک زرعی انقلاب لاسکیں گے۔ اس سے ہمارا خوراک کا مسئلہ حل ہوجائے گا اور معیشت کی بنیاد زیادہ ٹھوس و مضبوط ہوجائے گی جس سے تمام شعبوں میں ترقی اور خوش حالی کی راہ ہموار ہوجائے گی اس طرح ہمارے تقریباً ۵۰ فیصد مسائل حل ہوجائیں گے۔

(۲) صنعت کے شعبے میں ہمیں بنیادی اہمیت ایسی صنعتوں کو دینی چاہیے جو زراعت سے وابستہ ہوں۔ اگر ہم زراعت سے تعلق رکھنے والی صنعتیں قائم کریں اور چھوٹے یونٹوں کی صورت میں دستی کرگھوں کی صنعت کو نہ صرف رائج کریں بلکہ اسے ترقی بھی دیں تو اس سے ہمارے معاشرے میں ایک بے مثال صنعتی انقلاب آجائے گا اور کوئی صنعتی مسئلہ پیدا ہوئے بغیر ہزاروں افراد کو روزگار مہیا کیا جاسکے گا۔ بڑے صنعتی اداروں پر صرف برآمد کے لئے مال تیار کرنے کی پابندی لگا کر جو غلطی کی گئی ہے اُسے ختم کرکے مزید ۱۰ فیصد قومی مسائل حل کئے جاسکتے ہیں۔

(۳) چند نئے اسکول کھولنے پر بھاری رقم خرچ کرنے کے بجائے ہزاروں مسجدوں میں دینی اور ابتدائی تعلیم فراہم کی جا سکتی ہے اور اس طرح پورے ملک کے ہر قصبے اور ہر گاؤں میں ہر جگہ اسکول کھل جائیں گے جن پر اخراجات کی رقم بہت کم ہوگی۔ یوں مختصر مدت میں ملک میں خواندگی کا تناسب کافی بڑھ جائے گا۔ اس طرح مزید ۱۴ فیصد قومی مسائل حل ہو جائیں گے۔

(۴) ایک بہت بڑی فوج رکھنے کے بجائے اگر تمام صحت مند افراد کے لئے فوجی تربیت لازمی قرار دی جائے تو ہمارے پاس لاکھوں کی تعداد میں ایک رضاکار فوج موجود ہوگی۔ ہم پانچ لاکھ افراد کو چھاپہ مار جنگ کی تربیت دے سکتے ہیں۔ اس طرح ہم دنیا کی عظیم فوجی قوت بن سکتے ہیں۔ اس طرح ہمارے کئی تصفیہ طلب مسائل حل ہو جائیں گے یا یوں سمجھ لیجئے کہ مجموعی اعتبار سے کم از کم ۲۰ فیصد قومی مسائل حل ہو جائیں گے۔

(۵) سیمنٹ کی پیداوار میں کافی اضافہ اور کم قیمت کے مکانات کی تعمیر کے لئے سیمنٹ کی وافر سپلائی سے مزید ۱۱ فیصد قومی مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ سیمنٹ کے نئے کارخانے قائم کرکے اور حکومت کی طرف سے سیمنٹ کی قیمت پر رعایت سے دو کمروں، باورچی خانے، غسل خانے اور ایک چھوٹے سے برآمدے پر مشتمل مکان تقریباً تین ہزار روپے کی لاگت سے تیار ہو سکے گا۔

(۶) اسمگلنگ کی روک تھام سے ہمارے ۵ فیصد قومی مسائل کے حل میں مدد ملے گی۔

(۷) ہمارے معاشرے کی سب سے بڑی لعنت رشوت اور بدعنوانی کی لعنت ہے جس نے معاشرے کو بیمار بنا دیا ہے۔ یہ معاشرہ بیس سال پرانی "کھوٹ اور تباہ کن اقدار" پر قائم ہے۔ اگر ہم اپنے معاشرے کا ڈھانچہ بدل دیں اور اس کی نئے سرے سے تشکیل کریں جو زیادہ حقیقت پسندانہ ہو، جس کی بنیاد خدا کے خوف کے بنیادی نظریے پر ہو اور جس کے پس پشت یہ پختہ یقین کارفرما ہو کہ ہمیں اپنے ہر عمل کی جوابدہی کرنی ہوگی تو ہم رشوت جیسی لعنت کو ختم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اس سے ہمارے ۱۵ فیصد مسائل حل ہو جائیں گے۔ اسی طرح

ایک طرف تو ہم معاشرے کے افراد کے دلوں میں خدا کا خوف پیدا کریں اور دوسری طرف پولیس سے بدعنوان اور رشوت خور عملے کو نکالنے کے لئے پولیس کی تعداد میں بھاری تخفیف کر کے ایسا عملہ مقرر کریں جو اہل اور دیانت دار ہو۔ پولیس کے عملے کو لالچ اور دوسری ترغیبات سے محفوظ رکھنے کے لئے ان کی تنخواہیں دگنی کر دی جائیں کیونکہ پولیس کا عملہ اپنی کم تنخواہ میں اپنی جائز ضرورتیں پوری نہیں کر سکتا۔ اُمید ہے ان تبدیلیوں سے معاشرے کے امن و امان کو تقویت پہنچے گی اور زیادہ صحت مند ماحول پیدا ہو سکے گا۔

ان اقدامات کے علاوہ بھی ایک دیانت دار اور عوامی حکومت کو مزید کارروائیاں کرنی ہوں گی لیکن مُلک کے بڑے بڑے داخلی مسائل بخوبی حل ہو جائیں گے۔ داخلی مسائل سے نمٹنے کے بعد حکومت دوسرے مسائل کی طرف توجہ دے سکے گی مثال کے طور پر ایک ایسی بلاسودی معیشت کا قیام جو ساری دنیا کے لئے ایک مثال بن سکے۔ ہم نے مُلک کے بڑے بڑے مسائل کے جو حل پیش کئے ہیں وہ ناقابلِ عمل یا محض تخیلی حل نہیں ہیں۔ اگر خلوص اور وطن سے محبت کا جذبہ موجود ہو اور صرف اقتدار کی ہوس نہ ہو تو ہماری تجاویز پر بخوبی عمل کیا جا سکتا ہے۔ جو لوگ اقتدار کی کرسی حاصل کرنے کے لئے ہر جائز و ناجائز طریقے سے کام لیتے ہیں وہ ملک کے داخلی اور خارجی مسائل ہرگز حل نہیں کر سکتے۔ ہم نے اپنے ماضی کے تجربات سے صرف یہی سبق حاصل کیا ہے۔ آزادی کے بعد ہی سے نوکر شاہی نے اپنا وجود برقرار رکھنے کیلئے اسکیمیں تیار کیں۔ یہ اسکیمیں عموماً مغربی ملکوں کی اسکیموں کے انداز پر بنائی گئی تھیں اور ان سے مطلوبہ مقاصد حاصل نہیں ہو سکے۔ اکثر اوقات، منصوبہ بندی کے یہ ماہر مغربی ملکوں میں اپنی تمام تر تربیت کے باوجود قوم اور مُلک کی کوئی خدمت نہیں کر سکے۔ ان ماہروں کو ہر شے کو ایک مخصوص انداز میں — یعنی صرف اپنے نقطہ نظر سے دیکھنے کی تربیت دی گئی ہے اگرچہ بسا اوقات خدا یہ بات پسند نہیں کرتا۔ مثال کے طور پر انسانیت کی فلاح و بہبود کے جذبے کے ساتھ بلاسودی معیشت کی جو دانشمندانہ اور قابلِ عمل اسکیم تیار کی گئی اُسے ان ماہروں نے محض ایک تصور اور تخیل کی

رنگ آمیزی قرار دے کر مسترد کر دیا۔ اگرچہ یہ لوگ کھل کر اپنے خیالات کا اظہار نہیں کر سکتے مگر ان کے سوچنے کے انداز اور عمل سے ظاہر ہوتا ہے کہ "جیسے خدا نے بھی (نعوذ باللہ) ایک بلا سودی معیشت کے اصول مرتب کر کے غلطی کی ہے یہ اقتصادی نظام شاید صحرائی معیشت کے لئے تو مناسب ہے مگر جدید معیشت کے لئے موزوں نہیں" یہ لوگ اس موضوع اور دیگر موضوعات پر کوئی معقول بات سننے کے روادار نہیں چہ جائیکہ خود نہیں تو دوسروں کو اس کا تجربہ کرنے دیں کیونکہ انہیں خوف ہے کہ بعد میں وہ خود کم فہم اور کج رو ثابت ہونگے

یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ دنیا کے ہر ملک کی حکومت اس پر یقین نہیں رکھتی کہ بڑے مسائل کو سیدھے سادے طریقے پر حل کیا جا سکتا ہے۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ خدا نے کائنات کے ہر نظام کو انتہائی سادہ مگر مربوط طریقے پر بنایا ہے۔ نباتات و جمادات کی مثال ہمارے سامنے ہے؟ کیا ان کی تخلیق اور نشوونما میں کوئی پیچیدگی ہے؟ ہم پھولوں، پھلوں اور ترکاریوں کا مشاہدہ کرتے ہیں اور اپنی دنیا سے باہر کی چیزوں پر نظر ڈالتے ہیں، کہیں بھی کوئی پیچیدگی نظر نہیں آتی۔ یہ تو ہم انسانوں کی عادت ہے کہ سیدھے سادے معاملوں کو انتہائی پیچیدہ مسائل بنا دیتے ہیں اور پھر جب انہیں حل کرنے کے لئے پیچیدہ طریقۂ کار اختیار کیا جاتا ہے تو یہ مسائل ہماری دسترس سے باہر ہو جاتے ہیں۔ فطری امر ہے کہ کسی معاملے کو سلجھانے کے لئے اگر پیچیدہ طریقۂ کار اختیار کیا جائے تو مسئلہ ناقابلِ حل بن جاتا ہے۔ ان حالات میں ہمارے سامنے دو صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ ہم اپنی موجودہ روش ترک کریں اور یکے بعد دیگرے بحران، احتجاج، سماجی و سیاسی انتشار اور تشدد کی کارروائیوں کا سامنا کرتے رہیں اور دوسری صورت یہ ہے کہ ہم تمام حالات کا جائزہ لیں اور زیادہ حقیقت پسندی سے کام لے کر اپنے حالات و ضرورت کے مطابق تجاویز پر از سرِ نو عمل کریں۔ عقل و دانش کا تقاضا ہے کہ دوسرا متبادل طریقۂ کار ہی مناسب و معقول ہے۔ اس کتاب میں میں نے اسی نکتہ پر زور دیا ہے کہ ہمیں اپنی کوششیں از سرِ نو شروع کرنی چاہئیں اور صحیح سمت میں بڑھتے

بڑھنے کا عزم کر لینا چاہیے۔ اگر ہم خلوص نیت اور خدا پر مکمل ایمان کے ساتھ یہ عہد کر لیں تو خدا ہماری مدد اور رہنمائی کرے گا۔ بقا، کامیابی اور نجات کا یہی ایک راستہ ہے۔

خدا ہم سب کی رہنمائی کرے۔ آمین

ابراہیم احمد باوانی

مرحوم ابراہیم احمد باوانی ایک ممتاز تاجر اور صنعتکار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بلند پایہ دانشور اور مخیر" سماجی رہنما بھی تھے۔ معاشی، تعلیمی اور مذہبی شعبوں میں انکی وسیع تر فلاحی خدمات اور عملی کارکردگی، اندرون اور بیرون ممالک انکی وجہ شہرت اور نیک نامی کا باعث بنی۔

جناب ابراہیم باوانی اسلامی طرزِ معاشرت کے علمبردار تھے اور عمر بھر اسلامی فکر و شعور اُجاگر کرنے اور فروغ دینے کیلئے کوشاں رہے۔ انہوں نے کئی بڑے اور اہم ادارے قائم کیے اور متعدد قومی اور بین الاقوامی اداروں سے اعلٰی حیثیتوں میں وابستہ رہے۔

تین دہائیوں قبل شائع شدہ انکی زیرِ نظر تصنیف "قومی ترقی کا لائحہ عمل" پاکستان کی تعمیر و ترقی کے حوالے سے ایک رہنما کتاب ہے۔ موجودہ معاشی و اقتصادی کشاکش کے دور میں ہماری معیشت کے استحکام کیلئے اب اسکی ضرورت اور اہمیت پہلے سے زیادہ بڑھ گئی ہے۔

میمن بک فاؤنڈیشن نے اپنے ایک سرپرست مرحوم یحیٰی احمد باوانی کی دیرینہ خواہش کے مطابق انکے برادرِ عزیز ابراہیم باوانی مرحوم کی اس کتاب کی اشاعتِ دوئم کا اہتمام کر کے ایک قومی فریضہ انجام دیا ہے جسکے لیے ہم انکے بے حد مشکور ہیں۔

بیگم عائشہ باوانی (وقف) کراچی